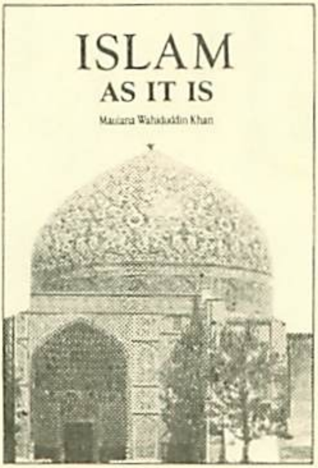
اپریل ۹۳ #2/-

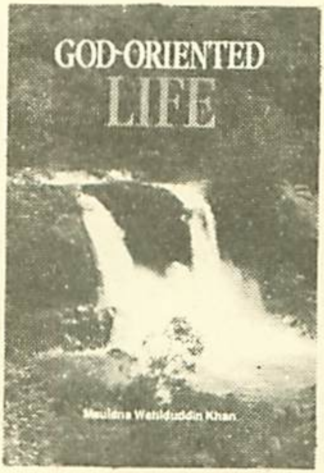
الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



اگر آپ لوگوں کے تعصّبات سے نہ ٹکرائیں
تو آپ ان سے اپنی ہر بات منوا سکتے ہیں





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۲ ، شمارہ ۱۸۷

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)
Single Copy Rs 6; Annual Subscription Rs 72/ $25 (Air-mail)

عقل کا امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ فرعون کے دربار میں ایک صاحب (رجل مومن) تھے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ آخر ایک موقع پر جب فرعون نے کہا کہ اس کا ارادہ ہے کہ وہ موسیٰ کو قتل کر دے، اس وقت وہ خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے فرعون اور تمام اہل دربار کے سامنے حضرت موسیٰ کی حمایت میں تقریر کی۔ یہ تقریر قرآن کی سورہ نمبر ۴۰ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

قرآن میں اس رجل مومن کی تقریر کو نقل کرتے ہوئے ایک مقام پر یہ الفاظ ہیں:
وقال الذی آمن یا قوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد (اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا کہ اے میری قوم، تم لوگ میری پیروی کرو، میں تمہاری رہنمائی سیدھے راستہ کی طرف کر رہا ہوں) المومن ۳۸

دوسری طرف قرآن میں فرعون کی تقریر کے ذیل میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں: قال فرعون ما اُریکم اِلا ما اریٰ وما اھدیکم الا سبیل الرشاد (فرعون نے کہا کہ میں تم کو اپنی سوچی سمجھی رائے بتا رہا ہوں اور میں تمہاری رہنمائی ٹھیک سیدھے راستہ کی طرف کر رہا ہوں) المومن ۲۹

فرعون کی حیثیت رجل کافر کی تھی مگر اس نے بھی وہی بات کہی جو رجل مومن نے کہی۔ دونوں نے کہا کہ میں تم کو سبیل الرشاد (راہ راست) کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں حق کا مبلغ جو الفاظ بولتا ہے وہی الفاظ باطل کے مبلغ بھی بولتے ہیں۔ دونوں صداقت کے حوالے سے اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ حق کا مبلغ اگر دلائل حق کے حوالے سے اپنی بات کہتا ہے تو باطل کے مبلغ بھی بظاہر دلائل حق ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔

مگر ایک کی دلیل حقیقی دلیل ہے اور دوسرے کی دلیل بناوٹی دلیل۔ یہاں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان تمیز کرے۔ وہ شوشہ اور حقیقت کے فرق کو سمجھے۔ وہ مغالطہ اور دلیل کو الگ کر کے دیکھے۔ وہ الفاظ سے گزر کر معانی کو پہچانے۔ جو شخص خدا کی دی ہوئی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو شخص خدا کی دی ہوئی عقل کو استعمال نہ کر سکے وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے گا۔

ہدایت کا قانون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مددگار شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں (البقرہ ۲۵۷)

ہدایت کا راستہ مکمل طور پر واضح ہو جانے کے بعد کیوں شیطان کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ کسی شخص کو روشنی سے تاریکی کی طرف اور ہدایت سے گمراہی کی طرف لے جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت خواہ کتنی ہی زیادہ واضح ہو جائے۔ اس عالم امتحان میں بہرحال یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ کلام ہدایت کی غلط تاویل کر کے اس کا الٹا مفہوم نکالا جا سکے۔

ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام کا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں اتنے زیادہ تضادات ہیں کہ میرے جیسا آدمی تو کبھی اس کو سچا مذہب نہیں مان سکتا۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے قرآن میں ایک طرف لکھا ہوا کہ لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی نہیں) دوسری طرف بخاری میں یہ حدیث ہے کہ آپ کے پیغمبر نے کہا کہ امرتُ ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں۔ یہاں تک کہ وہ کہہ دیں کہ لا الٰہ الا اللہ) آیت میں عمومی قانون کا ذکر ہے اور حدیث میں استثناء کا۔ مگر دونوں حکموں کو یکساں قرار دینے کی وجہ سے ان میں تضاد نظر آنے لگا۔

جو شخص کلام الٰہی کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھے، جو واقعی طور پر کلام کے منشا کو جاننا چاہے، اس کو اللہ کی نصرت حاصل ہوگی اور وہ کلام کے اصلی مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص غیر سنجیدہ ہو، جو بگڑے ہوئے ذہن کے ساتھ کلام کو پڑھے، اس کا ساتھی شیطان بن جائے گا۔ وہ کلام کا الٹا مفہوم اس کے ذہن میں ڈالے گا۔ وہ غلط تاویل کی راہ میں اس کو بھٹکاتا چلا جائے گا۔

اہل جنّت

قرآن (الحج ۲۲-۲۴) میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ اور وہاں ان کی پوشاک ریشم ہوگی۔ اور ان کو پاکیزہ قول کی ہدایت بخشی گئی تھی۔ اور ان کو خدائے حمید کا راستہ دکھایا گیا تھا (وھدوا الی الطیب من القول وھدوا الی صراط الحمید)

آیت کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی جنت کن لوگوں کو دی جائے گی۔ یہ ان لوگوں کو دی جائے گی جن کو دنیا میں قول طیب کی توفیق ملی تھی اور جن کو اس خدا کے راستہ کی ہدایت دی گئی تھی جس کی صفت الحمید ہے، جو تمام اعلیٰ خوبیوں کا مجموعہ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ کون سا امتحان ہے جس میں آدمی کو پورا اترنا ہے، اور وہ کیا صفت ہے جس کا ثبوت دینے کے بعد اس کو یہ اعزاز ملے گا کہ اس کے اوپر ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں۔ یہ امتحان دو لفظ میں یہ ہے —— حق کو پہچان کر اس کا اعتراف کرنا، اور ناموافق حالات کے باوجود اپنے آپ کو حق کے راستہ پر ڈالنا۔

جس دنیا میں ہر طرف پُر فریب الفاظ کا جال بچھا ہوا ہو۔ جہاں حق سے پھرے ہوئے لوگ غلبہ حاصل کیے ہوئے ہوں۔ ایسے ماحول میں ایمان کی صداقت کو پہچاننا بلاشبہہ سخت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ ایمان کے اس راستہ پر عملاً اپنے آپ کو ڈال دیا جائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اقوال کے پُر شور ہنگاموں میں قول طیب کو پانے کی توفیق ملی۔ جنھوں نے راستوں کے ہجوم میں صراط حمید کو دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ جو لوگ دنیا میں اس عظیم لیاقت کا ثبوت دیں وہ انسانیت کے سب سے زیادہ قیمتی لوگ ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ انھیں جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے۔ ان کے ساتھ وہ خصوصی معاملہ کیا جائے جو شاہی مہمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

کلمۂ حکمت

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ الحسن بن علی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے میرے بیٹے، تم اللہ سے ڈرو اور اس سے ڈرو جو اللہ سے نہیں ڈرتا (یا بُنیّ، خَفِ اللہَ وَخَفْ مَن لا یخافُ اللہَ)

یہ ایک بے حد جامع نصیحت ہے۔ جو آدمی اللہ کی پکڑ سے ڈرے، وہ زبان سے لے کر عمل تک ہر قسم کی برائی سے اپنے آپ کو بچائے گا۔ اسی طرح جو آدمی اللہ سے بے خوف لوگوں کے بارہ میں محتاط رہے، وہ ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔

اللہ کا ڈر آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ وہ ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ کیوں کہ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کوئی غلط بات کہی یا کوئی غلط کام کیا تو وہ اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔

اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اوپر اس کا خالق اور مالک ہے۔ ایسا آدمی ہر آن اپنے آپ کو زیر نگرانی سمجھنے لگتا ہے، اور جو آدمی ہر لمحہ اپنے آپ کو زیر نگرانی سمجھے وہ کبھی غلط گوئی یا غلط کاری میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

اللہ کا ڈر تمام برائیوں کے خلاف طاقتور ترین چیک ہے۔ وہ اس بات کا ضامن ہے کہ آدمی صحیح رخ پر سوچے اور صحیح انداز میں فیصلہ کرے۔ وہ اپنی ذاتی مرضی کے بجائے خدا کی مرضی کو اپنا رہنما بنا لے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کا ڈر دانائی کا سرا ہے (رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ)

اس کے برعکس وہ انسان ہے جس کا سینہ اللہ کے ڈر سے خالی ہو۔ جو اس سے غافل ہو کہ اس کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب دینے کے لیے حاضر ہونا ہے۔ جس کو نہ خدا کے غضب کی پروا ہو اور نہ جہنم کے عذاب کا اندیشہ، ایسا آدمی یقینی طور پر بے فکر ہو جائے گا۔ وہ کسی اصول کا پابند نہ ہوگا بلکہ اپنی خواہش کو اپنا رہنما بنا لے گا۔ اپنے مفاد یا اپنی انا کے لیے ظالمانہ طریقہ اختیار کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہوگا۔

تخلیقی جواب

للذین استجابوا لربهم الحسنی والذین لم یستجیبوا له لو ان لهم مافی الارض جمیعا ومثله معه لافتدوا به اولئك لهم سوء الحساب وماواهم جهنم وبئس المهاد (الرعد ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار کو لبیک کہا ان کے لیے بھلائی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کی پکار کو نہ مانا، اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے برابر بھی اور بھی تو وہ سب اپنی رہائی کے لیے دے ڈالیں۔ ان لوگوں کا حساب سخت ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں انسان کے انجام کا سارا دار و مدار استجابت (Response) پر ہے۔ صحیح استجابت کا ثبوت دینے والوں کے لیے انعام ہے اور بری استجابت کا ثبوت دینے والوں کے لیے سزا۔

جب حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو یہ انسانوں کے لیے سخت ترین امتحان ہوتا ہے۔ اس کی روشنی میں لوگوں کے مزعومات باطل قرار پاتے ہیں۔ جن کو انھوں نے بڑا بنا رکھا تھا وہ چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ مفادات کا پورا نظام منتشر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں بری استجابت یہ ہے کہ آدمی بپھر کر حق کا مخالف بن جائے۔ اور اچھی استجابت یہ ہے کہ وہ ثابت شدہ حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ پہلے انسان کے لیے دوزخ ہے اور دوسرے انسان کے لیے جنت۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا کا بھی ہے۔ یہاں بھی سارا انحصار استجابت پر ہے۔ یہاں اس گروہ کو عزت اور ترقی حاصل ہوتی ہے جو تخلیقی استجابت (Creative response) کا ثبوت دے سکے۔ اس کے برعکس جو گروہ غیر تخلیقی ثابت ہو اس کے لیے صرف یہی مقدر ہے کہ اس کو دنیا کے کوڑے خانہ میں جگہ ملے۔ یہاں ایک صورت غیر تخلیقی جواب کی ہے۔ یعنی وہی کا وہی لوٹانا۔ کسی نے پتھر مارا تو اس کو پتھر مارنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کا جواب تخلیقی جواب ہو۔ یعنی آدمی ردعمل سے بچ کر خود اپنے اندرونی کارخانہ میں ایک جواب تخلیق کرے اور اس کو دوسرے کی طرف لوٹائے۔

فطرت پر

ریقت دماء من بطنین من قریش۔ فجمع ابو سفیان کبارھم وقال۔ ھل لکم یا معشر قریش فی الحق اوما ھو افضل منہ۔ فقال القوم۔ وھل من شیئ افضل من الحق۔ فقال ابوسفیان۔ نعم انہ العفو۔ فقام القوم وتصالحوا۔

قبیلہ قریش کے دو خاندانوں میں خون بہانے کا واقعہ ہوا۔ ابوسفیان نے ان کے بڑوں کو جمع کیا اور کہا کہ اے قریش کے لوگو، تم خون کا بدلہ لینا چاہتے ہو یا وہ جو اس سے بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا، کیا کوئی چیز ہے جو اس سے بھی بہتر ہو۔ ابوسفیان نے کہا ہاں۔ اس سے بہتر چیز معافی ہے۔ پس لوگ اٹھے اور آپس میں صلح کرلی۔

یہ واقعہ اس انسان کے مزاج کو بتاتا ہے جو اپنی فطرت پر قائم ہو۔ قدیم عرب کے لوگ اسی فطری حالت پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت نے بھرپور طور پر اسلام کو قبول کرلیا، اور جب ایک بار اسلام کو قبول کرلیا تو پھر اس سے انحراف کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

جو آدمی اپنی فطرت پر قائم ہو وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جب کوئی سیدھی اور صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتا ہے۔ وہ ان نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوتا ہے جو لوگوں کے لیے سچائی کو ماننے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

فطرت پر قائم رہنے والا آدمی ضد، انتقام، انانیت، بے اعتراضی جیسے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ایک وسیع القلب اور وسیع الظرف انسان ہوتا ہے۔ وہ دُہرے انداز سے سوچنا نہیں جانتا۔ وہ نفرت اور بدگمانی کے تحت فیصلہ نہیں کرتا بلکہ جو فیصلہ کرتا ہے خالی الذہن ہو کر کرتا ہے۔ وہ اس بیماری سے خالی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنالے اور پھر کسی حال میں اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو۔ ایسے انسان کے شر سے بچنے کی واحد تدبیر اعراض ہے۔ یعنی اپنے آپ کو اس کی زد میں آنے سے بچانا۔

فطرت پر قائم رہنا خدا کے نقشہ پر قائم رہنا ہے۔ اور جو آدمی فطرت پر قائم ہو اس کو کمالِ انسانیت کی منزل تک پہنچنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔

انسان کا مسئلہ

برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰-۱۸۷۲) نے انسانی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے باہر فطرت کی جو طاقتیں ہیں ان کو سمجھنے اور قابو پانے کے معاملہ میں ہم نے دہشت ناک حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے مگر خود اپنے اندر کی طاقتوں پر قابو پانے کا فن ہم نے ابھی تک نہیں سیکھا :

We have learnt to understand and control to a terrifying extent the forces of nature outside us, but not those that are embodied in ourselves.

Bertrand Russell, *Individual and Social Ethics*

یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کے اندر کوئی ذاتی ارادہ نہیں۔ انسان جب فطرت کی طاقتوں پر قابو پانا چاہتا ہے تو ان کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہیں آتی۔ انسان فطرت کو سمجھ کر اس کو جو رخ دے دیتا ہے وہ عین اسی رخ پر قائم ہو جاتی ہے۔ فطرت کے قانون کو ماننے کے بعد انسان کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مکمل طور پر اس کو اپنا تابع بنا سکے۔

اس کے برعکس انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود اپنا ذاتی ارادہ رکھتا ہے۔ انسان قبول کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ رد کرنے کی طاقت بھی۔ فطرت کا معاملہ اگر یک طرفہ تھا تو انسان کا معاملہ دو طرفہ ہے۔ انسان کے اوپر کوئی اسکیم صرف اس وقت نافذ کی جا سکتی ہے جب کہ وہ خود بھی اس کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔

انسان پر قابو پانے کا معاملہ کسی خارجی فن کا معاملہ نہیں۔ یہ خود انسان کے ذاتی فیصلہ کا معاملہ ہے۔ یہ انسان کے اپنے شعوری فیصلہ کے تحت ہوگا نہ کہ کسی خارجی تکنیک کے ذریعہ سے۔

انسان اپنے ارادہ کو کیوں غلط راہوں میں استعمال کرتا ہے، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کو آزاد اور خود مختار سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اپنا مالک آپ ہوں۔ میں جو چاہوں کروں۔ یہی اصل غلطی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کیے بغیر انسان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

انسان اپنے خالق کے سامنے جواب دہ ہے۔ جواب دہی کا یہ احساس ہی سرکشی اور بے راہ روی کا اصل چیک ہے۔ اس کے سوا انسانی اصلاح کا اور کوئی طریقہ نہیں۔

غصہ نہ کرو

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو اندر ہی اندر پی جاتے ہیں (آل عمران ۱۳۴) اور جن لوگوں کے اوپر انھیں غصہ آیا ہے ان کو معاف کر دیتے ہیں (الشوریٰ ۳۷) اس بات کو حدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے :

عن حُمید بن عبد الرحمٰن عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال۔ قال رجل یا رسول اللہ اوصنی، قال : لا تغضب۔ قال الرجل۔ ففکرت حین قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما قال۔ فاذا الغضب یجمع الشر کلہ (مسند احمد)

حمید بن عبد الرحمٰن تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صحابی نے انھیں بتایا کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کرو۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر غور کیا تو میں نے جانا کہ غصہ تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔

انسان کی فطرت خیر پسند ہوتی ہے۔ یہ فطرت ہر انسان کو برائی سے روکتی ہے۔ وہ برائی کے خلاف ایک مستقل چیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان کبھی نارمل حالت میں برائی نہیں کر پاتا۔ کوئی شخص برائی صرف اس وقت کرتا ہے جب کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے جو اس کی فطری حالت کو درہم و برہم کر دے۔

یہ غیر معمولی حالت ہمیشہ انا کے بھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی آدمی کی انا جب بھڑکتی ہے تو اس وقت وہ فطرت کے قبضہ سے نکل کر غصہ کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایسے کام کر ڈالتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

انسانوں کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے کہ ان میں کچھ خیر پسند ہیں اور کچھ شر پسند۔ زیادہ صحیح تقسیم یہ ہوگی کہ مشتعل انسان اور غیر مشتعل انسان کا لفظ بولا جائے۔ مشتعل ہونے سے پہلے ہر انسان خیر پسند ہی ہوتا ہے۔ البتہ مشتعل ہونے کے بعد وہ شر پسند بن جاتا ہے۔

غصہ پر کنٹرول کرنا تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور غصہ کو بھڑکانا تمام برائیوں کا سرچشمہ۔

انسان کی بے بسی

ٹائم میگزین (۲۴ اگست ۱۹۹۲) کی کور اسٹوری صدر امریکہ جارج بش کے بارہ میں ہے
اس کے صفحہ ۲۰ پر جارج بش کی ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں صدر امریکہ اپنے ایک ہاتھ سے
اپنا سر پکڑے ہوئے ہیں۔ چہرے پر فکرمندی کے آثار ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے
بش ذہنی طور پر ختم نظر آتے ہیں :

Explaining his woes with a terse answer, "the economy", Bush seemed intellectually spent.

اس شمارہ میں ایک خصوصی انٹرویو بھی شامل ہے جو ٹائم کے نمائندہ مائیکل کریمر اور ہنری مولر۔
مرتب کیا تھا، اس انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ ہے :

). When you lie awake at night thinking about the crises that have perhaps not yet occurred in this new world order, what worries you most?

.. Unpredictability. You can't see very clearly where everything's going to come out. You see great problems, economic problems in the former Soviet Union, and you see ancient ethnic rivalries impacting over all that. I worry about the Middle East still, though I'm very pleased with the great progress that's been made. But you have some very bad actors, Saddam Hussein being one.

(*Time* August 24, 1992)

انٹرویور نے سوال کیا کہ جناب صدر، رات کے وقت جب آپ بستر پر ہوتے ہیں اور ا
آنے والے بحرانوں کے بارہ میں سوچ رہے ہوتے ہیں جو شاید ابھی اس نئے عالمی نظام میں وقو
میں نہیں آئے، اس وقت کیا چیز ہے جو آپ کو زیادہ پریشان کرتی ہے۔

صدر امریکہ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ معاملات کا ناقابل پیشین گوئی ہو
آدمی بہت زیادہ واضح طور پر دیکھ نہیں سکتا کہ چیزوں کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے، ہم بڑے بڑے مسا
کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے سابق سوویت یونین میں اقتصادی مسئلہ۔ اسی طرح قدیم نسلی رقابتیں جو ا
سب پر چھا جاتی ہیں۔ میں اب بھی شرق اوسط کے بارہ میں متردد ہوں۔ اگرچہ جو عظیم پیش رفت ہوئی ہے
اس سے میں بہت خوش ہوں۔ مگر ہم کو کچھ بہت برے کرداروں کا سامنا ہے۔ صدام حسین انھیں میں سے ا

سب کچھ امتحان

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بتاتے ہوئے کہا گیا ہے —— فرعون کی قوم کے سرداروں نے فرعون سے کہا۔ کیا تو موسیٰ کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا کہ وہ زمین میں فساد کریں اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ اور ہم ان کے اوپر پوری طرح قادر ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخری انجام اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ موسیٰ کی قوم نے کہا، تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا، قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ان کے بجائے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دے۔ پھر اللہ دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو (الاعراف ۱۲۷-۲۹)

ان آیات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل فرعون کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہے تھے۔ انھوں نے وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کی شکایت کی۔ حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں انھیں احتجاج اور مطالبات یا ٹکراؤ کا کوئی نسخہ نہیں بتایا۔ بلکہ یہ کہا کہ اللہ کی طرف رجوع ہو جاؤ اور صبر کرو۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ پھر تمہارے پیغمبر ہونے سے کیا فائدہ۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ تمہارے آنے کے بعد ہم کو حکومت اور اقتدار ملے گا۔ اور تم ہم کو بے اقتدار رکھ کر صبر کی تلقین کر رہے ہو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ حکومت اور اقتدار بھی صبر ہی کا ایک مرحلہ ہے۔ کیونکہ وہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ دیکھے کہ حکومت پانے کے بعد آدمی کیسا عمل کرتا ہے۔

اس دنیا میں اصل مسئلہ بااقتدار ہونا یا بے اقتدار ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی کو جو حالات ملے اس میں اس نے کس قسم کی کارکردگی کا ثبوت دیا۔ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور آنے والی دنیا بدلہ پانے کی جگہ۔ اس لیے آدمی کا نظر ہمیشہ اپنے حالات پر ہونی چاہیے نہ کہ خارجی حالات پر۔

سب سے بڑی بدبختی

الاستاذ خوزی الرفاعی (حلب، سوریا) ایک سفر کے تحت اندلس گئے۔ وہاں انھوں نے غرناطہ میں الحمرا نامی محل دیکھا جو مسلم دورِ حکومت میں نہایت اہتمام کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

هناك قصة منقوشة على الجدار۔ تس وي ان سائحا ميكسيكيا يدعى (آري ايكاسا) جاء وزوجته لزيارة الحمراء وبينما كان يطوف مستغرقا في دهشته ممايرى من مفاتن، رأى سائلا اعمى يتقدم من زوجته يطلب صدقة فقال لزوجته : اجزلي له العطاء يا امرأة فانه ليس في الحياة اقسى من ان يكون المرء اعمى في غرناطة (الدراسات الاسلامية، اسلام آباد، ۱۴۱۲ھ، صفحہ ۲۴۴)

وہاں ایک دیوار پر ایک قصہ لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میکسیکو کا ایک سیاح جس کا نام آری ایکاسا تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ الحمرا کو دیکھنے کے لیے یہاں آیا۔ اور جب کہ وہ اس کی کشش سے غیر معمولی متاثر ہو کر اس کو دیکھنے میں محو تھا، اس نے ایک اندھے فقیر کو دیکھا جو اس کی بیوی کے قریب ہو کر اس سے صدقہ مانگ رہا تھا۔ سیاح نے اپنی بیوی سے کہا کہ اے خاتون، اس کو خوب زیادہ دے دو۔ کیوں کہ دنیا میں اس سے بڑی بدبختی اور کوئی نہیں کہ آدمی غرناطہ میں اندھا ہو۔

مذکورہ سیاح کو یہ بات سب سے زیادہ بدبختی کی بات نظر آئی کہ ایک شخص الحمرا کے سامنے کھڑا ہو مگر وہ آنکھوں سے محروم ہونے کی بنا پر اس خوب صورت محل کو نہ دیکھ سکے۔ مگر ایک اور بدبختی ہے جو اس قسم کی تمام بدبختیوں سے زیادہ سخت ہے۔ اور یہ بدبختی وہ ہے جو آخرت میں پیش آئے گی۔ اس بدبختی کا ذکر قرآن کی ایک آیت میں اس طرح کیا گیا ہے :

ومن كان في هذه اعمى فهو في الآخرة اعمى واضل سبيلا (الاسراء ۷۲)

اور جو شخص اِس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور وہ بہت دور پڑا ہو گا راستے سے۔

آخرت وہ عالم ہے جہاں اللہ رب العالمین اپنے تمام جمال و کمال کے ساتھ ظہور فرمائے گا۔ وہاں آدمی رب کائنات کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں بدر کے چاند کو دیکھتا ہے۔ ایسی

حالت میں وہ شخص کتنا زیادہ بد بخت ہوگا جو اس ہستی کو دیکھنے سے محروم رہے جو ہر قسم کے جمال و کمال کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ امام احمد، امام مسلم اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے :

قال ، اذا دخل اهل الجنةِ الجنةَ و اهل النارِ النارَ نادیٰ منادٍ ؛ یا اهلَ الجنة إن لكم عند الله موعداً یرید ان ینجزكموه۔ فیقولون۔ وما هو۔ الم یثقل موازیننا، الم یبیض وجوهنا، ویدخلنا الجنة ویجرنا من النار۔ قال۔ فیكشف لهم الحجاب فینظرون الیه۔ فوالله ما اعطاهم الله شیئاً احب الیهم من النظر الیه ولا اقرّ لاعینهم۔

(تفسیر ابن کثیر ۲/۴۱۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے اہلِ جنت، تمہارے لیے اللہ کا ایک وعدہ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کو تمہارے لیے پورا کرے۔ اہل جنت کہیں گے کہ وہ کیا ہے۔ کیا ہمارے پلڑے بھاری نہیں کر دیے گئے۔ کیا ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا گیا۔ اور اللہ نے ہم کو جنت میں داخل کر دیا اور ہم کو آگ سے بچا لیا۔ اس کے بعد ان کے اوپر سے پردہ کھول دیا جائے گا، پھر وہ اپنے رب کو دیکھنے لگیں گے۔ پس خدا کی قسم، کوئی نعمت جو اللہ نے انھیں دی ہے وہ ان کے لیے اللہ کو دیکھنے سے زیادہ محبوب نہ ہوگی اور نہ اس سے زیادہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والی۔

آخرت میں دیدار الٰہی کی نعمت بلاشبہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اللہ کو دیکھنا ایک ایسا اعلیٰ وارفع تجربہ ہے جس کے مثل کوئی دوسرا تجربہ نہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس نعمت کبریٰ سے سرفراز کیے جائیں۔ اور کتنے بدبخت ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس حال میں پہنچیں کہ وہاں انھیں یہ خبر ملے کہ دیدار الٰہی کی نعمت سے بہرہ مند ہونا ان کے لیے مقدر نہیں۔

آیت فتنہ

قرآن میں دو جگہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اہل باطل سے لڑو اور ان سے لڑکر فتنہ کا خاتمہ کردو (البقرہ ۱۹۳، الانفال ۳۹) فتنہ کے لفظی معنی آزمائش کے ہیں۔ قرآن میں ہے: فما آمن لموسی الا ذریة من قومه علی خوف من فرعون وملئهم ان یفتنهم (یونس ۸۳) یعنی موسیٰ کی قوم میں سے تھوڑے نوجوانوں کے سوا کوئی ان پر ایمان نہ لایا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑوں کے ڈر سے کہ وہ انھیں ستائیں گے۔

عبداللہ بن عباس، قتادہ، الربیع، السدی وغیرہ کا قول ہے کہ اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک ہے اور اس کے ساتھ اہل ایمان کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں (قال ابن عباس وقتادة والربیع والسدی وغیرهم، الفتنة هناك الشرك وما تابعه من اذی المومنین) الجامع لاحکام القرآن ۲/۲۵۴

یہاں فتنہ سے مراد، باعتبار حقیقت، وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مذہبی جبر یا مذہب کی بنا پر ایذارسانی (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں مذہبی جبر پھیلا ہوا تھا۔ ہر ملک میں صرف حکمراں طبقہ کے مذہب کے لیے آزادی تھی، اور دوسرے مذاہب کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہ ہوتی تھی۔ یہی صورت حال عرب میں بھی مکمل طور پر قائم تھی۔ وہاں کے سرداروں کا مذہب شرک تھا۔ چنانچہ جب رسول اور اصحاب رسول نے توحید کی بات کی تو ان کو با اقتدار طبقہ کی طرف سے ہر قسم کی اذیتیں دی جانے لگیں۔

یہ صورت حال دعوت توحید کے لیے ایک مستقل رکاوٹ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا کہ اہل شرک سے لڑو اور اس وقت تک اپنی لڑائی جاری رکھو جب کہ مذہبی جبر کی صورت حال ختم ہو کر مذہبی آزادی کا دور آجائے۔ رسول اور اصحاب رسول نے جہاد کر کے اس حکم کی مکمل تعمیل فرمائی اور انسانیت کو ہمیشہ کے لیے مذہبی جبر سے نجات دلادی۔

اس حکم کی تعمیل میں جو جہاد کیا گیا اس کا ایک براہ راست پہلو تھا، اور دوسرا اس

ابالواسطہ پہلو۔ براہ راست پہلو یہ تھا کہ عرب اور اطراف عرب میں اہل شرک کا زور توڑ کر کامل طور پر مذہبی جبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کام رسول اور اصحاب رسول کی زندگی ہی میں پوری طرح انجام پا گیا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ تاریخ میں وہ عمل (process) جاری کر دیا جائے جس کے اثر سے بالآخر ساری دنیا سے ہمیشہ کے لیے مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔ ابتدائی انقلاب کے نتیجہ میں یہ تاریخی عمل بھی پوری طاقت کے ساتھ جاری ہوا۔ وہ مکہ، مدینہ، دمشق، بغداد، اسپین سے سلی ہوتا ہوا یورپ میں اور پھر امریکہ میں داخل ہو گیا۔

یہ عمل ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں شروع ہوا۔ اور بیسویں صدی عیسوی میں مغربی دنیا میں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام دنیا کی تمام قوموں نے انسانی آزادی کے اس دستاویز پر دستخط کر دیے جس کو حقوق انسانی کا عالمی منشور کہا جاتا ہے۔

اس طرح ختم فتنہ کے لیے قتال کا جو حکم دیا گیا تھا وہ اپنی آخری صورت میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب ہمیں یہ نہیں کرنا ہے کہ کسی صورت حال کو بطور خود "فتنہ" قرار دیں اور مذکورہ قرآنی آیت کا حوالہ دے کر اس کے خلاف جنگ شروع کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سرکش قرار دیے جائیں گے نہ کہ قرآنی حکم کی تعمیل کرنے والے۔

صحیح البخاری (کتاب التفسیر) میں مذکورہ دونوں آیتوں کی تشریح میں پانچ روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں جب عبد اللہ بن زبیر اور عبد الملک بن مروان کے گورنر الحجاج کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو عبد اللہ بن عمر رض مکہ میں موجود تھے۔ مگر انھوں نے اس جنگ میں شرکت نہ کی۔ ابن زبیر کے حامیوں میں سے دو شخص ان کے پاس آئے اور کہا کہ اللہ نے فتنہ کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہم یہ جنگ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں، پھر آپ ہمارے ساتھ اس میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔

عبد اللہ بن عمر رض نے جواب دیا کہ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے قرآنی حکم کی تعمیل تو ہم زمانۂ رسالت میں کر چکے (قد فعلنا) اس زمانہ میں اہل اسلام کمزور تھے۔ چنانچہ اہل شرک ان کے

دین کی بنا پر انھیں ستاتے تھے۔ اس وقت ان کا زور توڑنے کے لیے جنگ کی گئی یہاں
تک کہ اہل اسلام کی کثرت ہوگئی اور اہل شرک کا وہ فتنہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے مزید فرمایا:

قاتلنا حتی لم تکن فتنة وکان الدین لله وانتم تریدون أن تقاتلوا حتی تکون فتنة ویکون الدین لغیر الله۔

ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ کے لیے ہوگیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو، یہاں تک کہ پھر فتنہ آجائے اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جو لوگ آئے تھے وہ بنو امیہ کے سیاسی بگاڑ کے خلاف ان سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے حکمرانوں میں جو بگاڑ آیا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں "فتنہ" کہا گیا ہے۔ اس لیے ان پر فرض ہے کہ وہ ان حکمرانوں سے جنگ کر کے اس کا خاتمہ کریں۔

مگر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کی جو تشریح کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق فتنہ سیاست سے نہیں ہے بلکہ فتنہ جبر سے ہے۔ اس سے مراد حکمرانوں کی سیاسی اصلاح کی خاطر ان سے جنگ نہیں ہے، بلکہ مذہبی جبر کی صورت حال کو ختم کرنے کے لیے جنگ کرنا ہے۔ یہ جنگ اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ مذہبی جبر ختم ہو کر مذہبی آزادی کا ماحول قائم ہو جائے۔

نیز صحابی رسول کی اس تشریح سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی جبر سے مراد نفاذ قانون کی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ توحید پر عقیدہ اور توحید کی تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی مسلم حکمراں قانون اسلامی کا نفاذ نہ کر رہا ہو، اور کچھ لوگ قانون اسلامی کے نفاذ کے نام پر حکمراں سے ٹکراؤ کریں۔ اور حکمراں ایسے لوگوں پر سختی کرے تو یہ وہ مذہبی جبر نہ ہوگا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے۔

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بہت بامعنی ہے کہ ہم نے جنگ کر کے فتنہ کو ختم کر دیا تھا۔ مگر اب تم لوگ ایسی جنگ چھیڑ رہے ہو جس کے نتیجہ میں فتنہ کی حالت دوبارہ لوٹ آئے۔ یعنی تم نے مسلم حکمرانوں کی سیاسی اصلاح کے نام پر ان سے لڑائی شروع کی ہے، اور یہ تاثر دے رہے ہو کہ یہی اسلام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ حکمراں اسلام کے نام پر اٹھنے وا

ہر شخص کو اپنا حریف سمجھ کر انھیں ستائیں گے۔ اس طرح مذہبی جبر اور مذہبی ایذارسانی کی حالت دوبارہ نئی صورت میں قائم ہو جائے گی۔

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ تبصرہ موجودہ زمانہ کے ان لوگوں پر براہ راست طور پر صادق آتا ہے جو اپنے آپ کو انقلابی اسلام کا نمائندہ بتاتے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف مسلم ملکوں میں یہ کیا کہ مسلم حکمرانوں کے بگاڑ کے خلاف سیاسی جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے یہ انقلابی مہم شروع کر دی کہ ان غیر صالح حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل ہو کر صالح قیادت کا نظام قائم کریں۔

ان انقلابی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ملکوں کے حکمراں اسلام کو اپنے سیاسی حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریک کو کچلنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ آج یہ صورت حال ہے کہ آپ امریکہ اور انگلینڈ میں تو اسلام کے نام پر تحریک چلا سکتے ہیں۔ مگر مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر تحریک چلانے کے مواقع نہیں۔ قرآن میں جس چیز کو فتنہ (مذہبی جبر) کہا گیا تھا، وہ آج سب سے زیادہ مسلم ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ تمام تر اسی قسم کے نام نہاد مسلم رہنماؤں کی غلط تحریکوں کے نتیجہ میں ہوا ہے جن پر تبصرہ کرتے ہوئے صحابی رسول نے کہا تھا کہ ہم نے لڑ کر فتنہ کو ختم کر دیا تھا اور تم اس لیے لڑ رہے ہو کہ فتنہ دوبارہ مسلم معاشرہ میں واپس آجائے۔

ترقی کا راز

گلاب کا درخت فطرت کا ایک مظہر ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک علامت ہے جو ہر دیکھنے والے کو بتا رہا ہے کہ دنیا میں ہم کو کس طرح زندگی گزارنا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں کہ گلاب کے درخت میں بیک وقت پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی۔ ہر عقل مند آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ پھول کو لے لیتا ہے اور کانٹے کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں خوش گوار پہلو ہیں اور اسی کے ساتھ ناخوش گوار پہلو بھی۔ یہاں بھی دانش مندانہ طریقہ یہ ہے کہ خوش گوار پہلو کو لیا جائے اور ناخوش گوار پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہمارے پرائم منسٹر نے ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر میں کہا کہ ہم کو ایک قسم کے موریٹوریم کی ضرورت ہے۔ یعنی چند سال کے لیے ہم لوگ طے کر لیں کہ ہم اختلافی باتوں کو بازو میں رکھ دیں اور اتفاقی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ موجودہ حالات میں اس قسم کا موریٹوریم ملک کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

تاہم یہ صرف چند سال کی بات نہیں بلکہ پوری زندگی کی بات ہے۔ کوئی فرد یا کوئی قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب کہ وہ اس حکمت کو اختیار کرلے کہ انھیں مسائل سے اعراض کرنا ہے اور مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔

آپ اپنی سواری لے کر سڑک پر نکلتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سڑک پر آپ کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ آپ دوسروں سے ٹکراتے نہیں۔ بلکہ دوسروں سے بچتے ہوئے اپنا سفر طے کرتے ہیں۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں ہے۔ یہ دنیا بہت سے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ اب اس دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہر ایک، دوسرے کا لحاظ کرے۔ ہر ایک دوسرے کو راستہ دیتے ہوئے اپنا راستہ اختیار کرے۔ دوسروں کی رعایت کرنا اپنے لیے کامیاب سفر حاصل کرنے کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

ہندستان میں مختلف مذہب اور کلچر کے لوگ رہتے ہیں۔ ان تمام کو بدل کر ایک مذہب اور ایک کلچر بنانا ممکن نہیں۔ اگر اس قسم کی وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو وحدانیت تو پیدا نہیں ہوگی۔ البتہ وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش میں ملک برباد ہو جائے گا۔ اس لیے ہم کو وحدانیتِ کلچر کے بجائے تعددِ کلچر کے اصول کو اختیار کرنا ہے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی کامیابی کا طریقہ بھی۔

آج ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ رواداری (ٹالرنس) ہے۔ رواداری کا مطلب ہے اپنے طریقہ پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے طریقہ کا احترام کرنا۔ اسی رواداری پر صدیوں سے ملک کا انتظام چلا آرہا ہے۔ اسی پر وہ آئندہ بھی چل سکتا ہے۔ خواہ ایک فرقہ کے لوگ ہوں یا مختلف فرقہ کے لوگ، رواداری ہر حال میں ضروری ہے۔ حتی کہ ایک خاندان کے دس افراد اگر ایک ساتھ رہتے ہوں تو وہ بھی کامیاب گھر اسی وقت بنا سکتے ہیں جبکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں۔

دو سال پہلے میں شولاپور گیا۔ وہاں ایک جلسہ میں ایک ہندو بھائی کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے اور میری ماں ویجیٹیرین تھی۔ مگر دونوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میری ماں روزانہ صبح کو اٹھ کر پہلے میرے باپ کے لیے کھانا بناتی۔ اور اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتی۔ اس کے بعد وہ نہا کر اپنے لیے ویجیٹیرین کھانا بناتی۔ اسی طرح وہ دونوں پوری زندگی میں عمل کرتے رہے۔ انھوں نے نہایت پُرمسرت زندگی گزاری۔

یہی قومی تعمیر کا واحد طریقہ ہے۔ قومی زندگی میں ہم کو یہی کرنا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو گوارا کریں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ انسانی احترام کے اصول پر معاملہ کریں جس طرح وہ اپنے لیے یہ حق سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنے مذہب اور کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہو اسی طرح وہ دوسروں کو بھی یہ حق دیں کہ وہ اپنے پسندیدہ مذہب اور اپنے پسندیدہ کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں۔ اس قسم کے فرق کو رواداری کے خانہ میں ڈالنا ہے، اس کو اختلاف کا مسئلہ نہیں بنانا ہے۔ یہی قومی تعمیر کا واحد کامیاب طریقہ ہے۔

مثلاً ایک فرقہ کے لوگ شہر کی سڑک پر اپنا جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں کچھ پُرجوش لوگ

ایسے نعرے بھی لگا دیتے ہیں جو دوسرے فرقہ کے لیے ناگوار ہوں)۔ اب دوسرے فرقہ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کو وقار کا مسئلہ بنا لے اور جلوس کو روکنے یا اس کی روٹ بدلوانے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ جلوس کے مسئلہ کا حل جلوس کو نظر انداز کرنا ہے نہ کہ اس سے ٹکرانا۔ اگر جلوس کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ چند منٹ میں اپنے آپ ختم ہو جائے گا مگر جب روک ٹوک اور مزاحمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ جو چیز ابتداءً صرف جلوس کی حیثیت رکھتی تھی وہ فساد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے انتخاب (چوائس) جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے، بلکہ جلوس اور فساد میں ہے۔ جلوس کو اگر روکا جائے تو اس کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوگی وہ بے جلوس صورت حال نہیں ہے، بلکہ دو فرقوں کے درمیان فساد ہے جس میں جان و مال کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک طرف مسائل ہوتے ہیں اور دوسری طرف مواقع۔ یہ قدرت کا قانون ہے اور اس دنیا میں کبھی اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو استعمال کیا جائے۔ مسائل کو نظر انداز کرنا گویا اپنے لیے عمل کا وقفہ حاصل کرنا ہے۔ اور مسائل سے الجھنا ملے ہوئے وقت کو ضائع کر دینا۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ کو آکاش وانی ناگپور سے نشر کی گئی۔

مطالعۂ قرآن

قرآن کی سورہ العنکبوت مکی دور میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اس زمانہ میں اسلام کے
لفین اہل اسلام پر بہت ظلم کر رہے تھے۔ روزانہ کی سختیوں نے وہاں زندگی کو ایک مصیبت
دیا تھا۔ اس وقت اہل اسلام سے کہا گیا کہ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ تم مکہ چھوڑ کر دوسری
ہ چلے جاؤ اور وہاں خدا کی عبادت کرو۔ چنانچہ مسلمانوں نے اولاً حبش کی طرف ہجرت کی اور
ں کے بعد مدینہ کی طرف۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں یہ ہیں :

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو بے شک میری زمین وسیع ہے ، پس تم میری ہی
عبادت کرو۔ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور
جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کو ہم جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے
جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا اجر ہے عمل کرنے
والوں کا جنھوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا
رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا، جاننے
والا ہے (العنکبوت ۵۶ - ۶۰)

ان آیات میں "صبر" کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ صبر کے لغوی معنی ہیں جمنا۔ جمنے
کا مطلب اگر دشمن سے ٹکراؤ پر جمنا ہو تو مکہ کے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے لڑنا چاہیے تھا مگر
اس کے بجائے انھوں نے یہ کہا کہ وہ خدا و رسول کی رہنمائی کے مطابق ، مکہ کو چھوڑ کر باہر
کے علاقوں میں چلے گئے تاکہ جس عبادت کے مواقع ان کو مکہ میں نہیں مل رہے ہیں اس کو باہر
جا کر حاصل کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا مطلب عبادت پر جمنا ہے نہ کہ دشمن سے ٹکراؤ پر جمنا۔ اگر
صبر سے مراد یہ ہو کہ دشمن سے مقابلہ کرنے میں جمے رہو تو مکہ کے مسلمانوں سے کہا جاتا کہ تم لوگوں
کے خلاف مکہ میں اگر ظلم کیا جا رہا ہے تو تم ظلم کرنے والوں سے لڑ جاؤ۔ کسی حال میں بھی تم مکہ کو نہ چھوڑو ،
خواہ اس مقابلہ آرائی میں تم کو وہیں مر جانا پڑے۔ گویا یہاں عدم قتال پر صبر کرنا مراد ہے نہ کہ قتال پر صبر کرنا۔

اخلاقی سلوک

دنیا میں جب لوگ مل جل کر رہتے ہیں تو بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کا سابقہ دوسرے سے پڑتا ہے۔ گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ ایسے مواقع پر دوسروں کے ساتھ شرافت اور انصاف کا معاملہ کرنا اچھا اخلاق ہے، اور پستی اور بے انصافی کے ساتھ معاملہ کرنا برا اخلاق۔

اچھے اخلاق کی سب سے پہلی پہچان یہ ہے کہ آپ اپنے دل سے دوسروں کے خیر خواہ ہوں۔ آپ ہمیشہ دوسروں کا بھلا چاہیں۔ دوسروں کے لیے آپ کے دل میں محبت ہو، نفرت نہ ہو۔ دوسروں کی ترقی کو دیکھ کر آپ کے اندر جلن نہ پیدا ہو اور دوسروں کو برے حال میں دیکھ کر آپ انھیں حقیر نہ سمجھیں۔ دوسروں کے بارے میں آپ کوئی بات سنیں تو آپ اس کو اچھے معنی میں لیں، اس کی وجہ سے آپ دوسروں کے بارے میں بدگمان نہ ہو جائیں۔

دوسروں کا خیر خواہ بننے کی پہچان کیا ہے۔ اس کی سادہ پہچان یہ ہے کہ دوسروں کے لیے آپ وہی پسند کرنے لگیں جو آپ خود اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ آپ کو یہ پسند ہے کہ دوسرے لوگ آپ کا اعتراف کریں تو آپ بھی اسی طرح دوسروں کا اعتراف کریں۔ آپ کو پسند ہے کہ کوئی آپ کو بے عزت نہ کرے تو آپ بھی اسی طرح دوسروں کو کبھی بے عزت نہ کریں۔ آپ کو پسند ہے کہ کوئی آپ کا مال بے جا طور پر نہ لے تو آپ بھی دوسروں کا مال بے جا طور پر لینے سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائیں۔

دنیا میں آدمی کا سابقہ جب دوسروں سے پیش آتا ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ کبھی دوسروں کے ساتھ اس کو شکایت ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر خوش اخلاقی کے رویہ پر قائم رہنے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے اندر اعراض کرنے اور بھلا دینے کی عادت ہو۔

دوسروں کی زبان سے آپ کے لیے کڑوا بول نکلے مگر آپ دوسروں کو اپنا کڑوا بول نہ سنائیں۔ دوسروں سے آپ کو کوئی چوٹ لگ جائے تو آپ ایسا نہ کریں کہ آپ بھی اس کے خلاف انتقامی جذبہ لے کر بیٹھ جائیں۔ دوسرا آپ کو نظر انداز کر رہا ہو، اس وقت بھی آپ ایسا نہ کریں کہ اپنے آپ کو اس سے کاٹ لیں۔ اس دنیا میں اچھے اخلاق پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی برے اخلاق والوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرے۔ اور برائی کے جواب میں بھی اچھائی کا نمونہ پیش کرے۔

الرسالہ اپریل ۱۹۹۳ ۲۴

اچھے اور برے اخلاق کا بہت زیادہ تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ کڑوا بول بداخلاقی کی
امت ہے اور میٹھا بول خوش اخلاقی کی علامت۔ زبان سے نکلے ہوئے کچھ الفاظ ایک شخص کو
پ کا دشمن بنا سکتے ہیں۔ اور اسی زبان سے نکلے ہوئے کچھ اور الفاظ کا اثر یہ ہو سکتا ہے کہ ان کو
سننے والا آپ کا قریبی دوست بن جائے۔

اخلاق کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ آپ کے اندر دوسروں کے لیے فیاضی اور اعلیٰ ظرفی کے
ربات ہوں۔ دوسروں کی سخت بات کو برداشت کرکے آپ ان کے ساتھ نرم بات بولیں۔
دوسرے سے آپ کو نقصان پہنچے تب بھی آپ اس کو نفع پہنچائیں۔ دوسرے سے آپ کو کچھ نہ
ملنے والا ہو تب بھی آپ اس کو دینے کی کوشش کریں۔ دوسرا آپ کو اشتعال دلائے تب بھی آپ
نتعل ہوئے بغیر اس کے ساتھ شرافت کا معاملہ کریں۔

اخلاق اس بہتر سلوک کا نام ہے جس میں شرافت، خیر خواہی اور اعلیٰ ظرفی کی اسپرٹ پائی
ائے۔ با اخلاق انسان وہ ہے جس کی زندگی میں سورج کی روشنی اور پھول کی مہک جیسی خصوصیات
یدا ہو جائیں۔

اچھا سماج بنانے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اچھا اخلاق ہے۔
س سماج کے افراد اچھے اخلاق والے ہوں، جو ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق اور انسانیت
کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزاریں، وہ سماج یقیناً بہتر سماج ہوگا۔

بہتر اخلاقی سماج ہی کا دوسرا نام بہتر انسانی سماج ہے۔ سماج کو اونچا اٹھانا ہے تو اخلاق کو
ونچا اٹھائیے۔ سماج کو درست کرنا ہے تو اس کے افراد کو اخلاقی اعتبار سے درست کیجئے۔
ی بہتر سماج بنانے کا واحد یقینی راستہ ہے۔ اِس کے سوا اُس کا اور کوئی راستہ نہیں۔

ٹ : آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۴ فروری ۱۹۹۲ کو نشر کیا گیا۔

جنت کا انعام

صحیح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی صلی اللہ علیہ وسلم خدیجۃ وفضلہا کے تحت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

أتى جبريل النبيَّ صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسولَ الله، هذه خديجة قد أتتْ معها إناءٌ فيه إدامٌ أو طعامٌ أو شراب - فإذا هي أتتك فاقرأْ عليها السلام من ربّها ومنّي وبشّرها ببيتٍ في الجنة من قَصَب لا صَخَب فيه ولا نَصَب۔

جبریل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ خدیجہ آرہی ہیں ان کے ساتھ ایک برتن ہے۔ اس میں کھانے اور پینے کا سامان ہے۔ جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو ان کو ان کے رب کی طرف سے سلام کہہ دیں اور میری طرف سے بھی۔ اور ان کو خوش خبری دے دیں کہ جنت میں ان کے لیے ایک گھر ہوگا جس میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف۔

یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ اس سلسلہ میں ابن حجر العسقلانی نے الطبرانی کی ایک روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کہ آپ مکہ کے قریب غار حرا میں تھے (فی روایۃ سعید بن کثیر عند الطبرانی، إن ذلك كان وهو بحراء) فتح الباری ۱۷۲/۷

یہ غالباً مکی دور کے اس زمانہ کی بات ہے جب کہ اہل مکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے چنانچہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر نماز اور عبادت کے لیے مکہ کے باہر پہاڑوں کی طرف جانا پڑتا تھا۔ غالباً اسی زمانہ میں آپ عبادت کے لیے حرا نامی غار میں بھی گئے جو مکہ سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ نے آپ کے لیے کھانا تیار کر کے اس کو غار حرا میں پہنچایا۔

مذکورہ واقعہ بعثت نبوی کے ابتدائی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت مکہ میں آپ ایک بے یار و مددگار شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس وقت کے حالات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اس طرح مسلّم شخصیت نہ تھی جیسا کہ وہ آج نظر آتی ہے۔ اس وقت سارا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس وقت آپ کی شخصیت ایک متنازعہ شخصیت تھی۔ لوگ آپ کو شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ وہ آپ کے دعوے نبوت پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس نزاعی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ لوگ آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے اوپر آوازے کستے۔ آپ لوگوں کے طنز کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ لوگوں کی طرف سے مسلسل آپ کو ایذا پہنچانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس طرح آپ کی زندگی گویا شور وغل اور تکلیف ومصیبت کے درمیان تھی۔ یہ دونوں تلخ تجربے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آرہے تھے اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ کو بھی۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں حضرت جبریلؑ کی طرف سے مذکورہ بشارت نازل کی گئی۔ اور ان کی توجہ کو حال کے بجائے مستقبل کی طرف موڑ دیا گیا۔

مکی دور کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیکسی اور عدم قبولیت کا جو ماحول تھا، اس سے حضرت خدیجہ نے کوئی اثر نہیں لیا۔ ان ناموافق حالات سے اوپر اٹھ کر انھوں نے آپ کے پیغمبر ہونے کی حیثیت کو پہچانا۔ اور دل وجان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ وہ صرف آپ کی زندگی کی ساتھی نہیں بنیں بلکہ وہ آپ کے مشن میں بھی آپ کی ساتھی بن گئیں۔

حضرت خدیجہ کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے جنّت کا وہ محل لکھ دیا گیا جو ہر قسم کے شور سے بھی خالی ہو اور ہر قسم کی تکلیف سے بھی۔ یہ بشارت براہ راست طور پر حضرت خدیجہ کے لیے ہے، اور بالواسطہ پر ہر اس شخص کے لیے جو اس نوعیت کے ایمان کا ثبوت دے جس کا ثبوت حضرت خدیجہ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

ایک تضاد

مارچ ۱۹۸۴ میں میں ایک عرب ملک میں تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ہندستان کی ایک جماعت کے ذمہ دار بھی وہاں موجود تھے۔ ہندستان سے وہ عربی زبان میں ایک رپورٹ تیار کر کے لے گئے تھے جس میں ان کی جماعت کے وہ کارنامے تحریر کیے گئے تھے جو اس نے تقسیم ہند کے بعد سے اب تک انجام دیے ہیں۔ اس رپورٹ کی ایک کاپی انھوں نے ازراہ عنایت مجھ کو بھی عطا فرمائی۔

اگلے دن ایک شیخ کے یہاں شام کا کھانا تھا۔ یہاں صرف میں اور مذکورہ بزرگ دو آدمی تھے جو ہندستان سے تعلق رکھتے تھے۔ بقیہ تمام کے تمام شیوخ عرب تھے۔ کھانے سے پہلے ایک بڑے کمرہ میں غیر رسمی نشست تھی۔ اس مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ بزرگ نے فرمایا: ہندستان میں تو مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہاں ان کو مسجد میں بھی سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

اس مجلس میں میری نشست ان کے قریب ہی تھی۔ میں نے ان کے کان میں کہا کہ حضرت، آپ یہ کس ملک کی بات کر رہے ہیں۔ کیا یہ اسی ہندستان کا قصہ ہے جس سے نکل کر میں یہاں آیا ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا آپ کو صفدر جنگ کی مسجد کا حال معلوم نہیں۔ اس مسجد کے اندر نماز پر حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے۔ میں نے کہا استغفر اللہ۔ پھر آپ کو یوں کہنا چاہیے کہ ہندستان کی تین لاکھ مسجدوں میں ہمیں اذان اور نماز کی کھلی اجازت ہے۔ البتہ صفدر جنگ کی مسجد جو آثار قدیمہ کے تحت ہے، وہاں آثار قدیمہ کے قانون کے مطابق تالا لگا دیا گیا ہے۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ کس طرح ایک عجیب و غریب تضاد میں مبتلا ہے۔ ہندستان کی مسلم جماعتوں اور یہاں کے مسلم اداروں کا حال یہ ہے کہ جب وہ "ہندستان میں ہمارا کام" کے موضوع پر لکھیں گے یا بولیں گے تو ان کے پاس عظیم کارناموں کی لمبی فہرست ہوگی۔ ان کی رپورٹ پڑھ کر ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ اس ملک میں وہ ہمالیہ پہاڑ کے برابر بڑے بڑے کام انجام دے رہے ہیں۔

مگر انھیں جماعتوں اور اداروں کے ذمہ دار جب "ہندستان میں مسلمان" کے موضوع پر لکھیں گے یا بولیں گے تو ان کی کہانی بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اب ان کے بیان کو پڑھ کر یا سن کر ایسا محسوس ہوگا جیسے اس ملک میں مسلمان صرف قتل و غارت گری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ترقی تو درکنار، یہاں ان کو زندہ رہنے کے مواقع بھی حاصل نہیں۔

یہ کیسا عجیب تضاد ہے۔ لوگوں کو جب خود اپنا کارنامہ بیان کرنا ہو تو اسی ہندستان میں ان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیں اور پُر فخر طور پر اس کی شاندار رپورٹ تیار کر کے اسے ساری دنیا میں پھیلائیں۔ مگر جب ان کو ہندستان میں مسلم قوم کی حالت بیان کرنا ہو تو اچانک یہی ملک مسلمانوں کے لیے محرومی اور بربادی کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کو تو اس ملک میں جینے تک کا موقع حاصل نہیں۔ مگر خود ان مسلم رہنماؤں کو ناقابل قیاس حد تک یہ مواقع حاصل ہیں کہ وہ یہاں بڑے بڑے پُر فخر کارنامے انجام دے سکیں۔

کسی ملک میں بیک وقت یہ دونوں حالتیں پائی نہیں جا سکتیں۔ اگر ملک میں بسنے والے مسلمان تعصب اور ظلم کا شکار ہوں، ان کو ہر اعتبار سے برباد کیا جا رہا ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اسی ملک کے رہنما خود اپنے کارناموں کے عالی شان گنبد تعمیر کر سکیں۔ اور اگر رہنماؤں کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ شاندار طور پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیں تو ایسی حالت میں اسی ملک کے اندر ان کی قوم برباد اور خستہ حال نہیں ہو سکتی۔

مسائل انسانی سماج کا خاصہ ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ اور ہر سماج میں موجود رہیں گے۔ اس فطری حقیقت کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو ہندستان میں مسلمانوں کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جو انفرادی یا ملی سطح پر انھیں درکار ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا جائے۔

ایک شرعی اصول

اسلام کے قواعد طہارت کے مطابق، جانور کا گوبر اور پیشاب نجس ہے (کل رجیع وبول فھونجس) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد لابن رشد القرطبی، ۱/۸۰-۸۱

حیوانی گوبر کا شمار نجاست غلیظہ میں کیا گیا ہے۔ آدمی کے کپڑے میں اگر ایک درہم کے بقدر لید یا گوبر لگ جائے اور آدمی اسی حالت میں نماز پڑھ لے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی نماز کو دہرائے۔ لیکن اگر عذر کی صورت پیدا ہو جائے تو یہی نجاست پاک کے حکم میں داخل ہو جاتی ہے:

ان فقہاءنا الائمۃ الاولین قد افتوا بتطہیر ارواث المواشی بالنسبۃ لاھل القری والبوادی لعموم البلوی حیث یعسر التحرز عنھا۔ ای انھا یعفی عن نجاستھا تیسیراً علیھم ودفعا للحرج عنھم، نظراً للصعوبۃ صیانۃ آبارھم المکشوفۃ وغدرانھم من ھذہ الارواث۔

دور اول کے ائمۂ فقہا نے دیہاتوں اور صحراؤں میں رہنے والوں کے لیے عموم بلوی کی بنا پر مویشیوں کی لید کے پاک ہونے کا فتوی دیا ہے جب کہ اس سے بچنا دشوار ہوتا ہے۔ یعنی ان کی نجاست سے درگزر کیا جائے گا تاکہ ان لوگوں کے لیے آسانی ہو اور ان پر تنگی نہ رہے، اس بات کے پیش نظر کہ ان کے لیے یہ سخت مشکل ہے کہ وہ اپنے کھلے کنوؤں اور تالابوں کو ان کی لید سے بچائیں۔

(دکتور غریب الجمال، التامین، صفحہ ۲۴۰)

اس مثال سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ یہ اصول، شریعت کی اصطلاح میں یسر یا رفع حرج ہے۔ قرآن (الحج ۷۸) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (وما جعل علیکم فی الدین من حرج) اسی طرح روزہ کے حکم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے لیے سختی نہیں چاہتا (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر)

اسی بنا پر علمار اسلام کے درمیان اس مسئلہ پر کامل اتفاق ہے۔ فقہار نے اس کو شریعت کے ایک اہم اصول کے طور پر اختیار کیا ہے۔ علمار کے چند اقوال یہ ہیں :

الضرورات تبیح المحظورات۔	ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہیں۔
ما حُرِّم لذاتہ یباح للضرورۃ۔	جو چیز فی نفسہ حرام ہے وہ ضرورت پر جائز ہو جاتی ہے۔
ما حُرِّم لسد الذریعۃ یباح للحاجۃ۔	جو چیز سد ذریعہ کے طور پر حرام ہو وہ حاجت کے لیے جائز ہو جاتی ہے۔
اذا ضاق الامر اتّسع۔	جب معاملہ تنگ ہو جائے تو کشادگی ہو جاتی ہے۔
المشقۃ تجلب التیسیر۔	مشقت آسانی لے آتی ہے۔

شریعت کے مذکورہ اصول کا تعلق صرف طہارت اور نجاست کے معاملات سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ جب بھی کسی معاملہ میں عموم بلویٰ کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کے بعد گنجائش اور رعایت کی یہ سہولت کسی قباحت کے بغیر حاصل ہو جائے گی۔

اس کی ایک مثال بینکنگ کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانہ کے تجارتی اور اقتصادی معاملات میں بینکنگ کا دخل اس سے بھی زیادہ ہو گیا ہے جتنا دیہات کے کسانوں کے لیے گوبر کا معاملہ۔ ایسی حالت میں یہ بات شرعی مزاج کے خلاف ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر بینکنگ کے معاملہ میں وہ پابندیاں عائد کی جائیں جو دور عباسیہ کے مسلمانوں کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں۔

شریعت نے اگر اہل قُریٰ کے لیے حسب ضرورت سہولتیں تجویز کی ہیں تو ناممکن ہے کہ وہی شریعت اہل مدُن کے لیے ضرورت کے باوجود سختیاں عائد کرنے کا اصول اختیار کرے۔ مزید یہ کہ شرعی احکام کا تعلق جس طرح جزئیات سے ہے اسی طرح کلیات سے بھی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ شریعت جزئی امور میں رعایت دے اور کلی امور میں وہ رعایت دینے سے انکار کر دے۔

تنقید کا اصول

ایک صاحب نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپ صحابۂ کرام، علماء عظام سب پر تنقید کرتے ہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل لغو بات ہے۔ صحابہ اور علماء کے درمیان کاما نہیں ہے بلکہ فل اسٹاپ ہے۔ علماء پر تنقید کا ہر شخص کو حق ہے، مگر صحابہ پر تنقید کا کسی کو حق نہیں۔

اصحاب رسول کا معاملہ ایک خصوصی معاملہ ہے۔ ان کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ لاتتخذوھم من بعدی غرضا (میرے بعد ان کو نشانہ نہ بناؤ) اس لئے صحابہ مطلق طور پر تنقید سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے سلسلہ میں صرف یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں اگر دو صحابی کے درمیان ایسا اختلاف پایا جائے جس میں تطبیق نہ دی جا سکتی ہو تو دونوں میں سے ایک کا انتخاب کیا جائے گا۔ یعنی ایسے مسئلہ میں ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے گا نہ کہ تنقید کا طریقہ۔

مگر صحابہ کے بعد جہاں تک دوسرے علماء اور رہنماؤں کا تعلق ہے تو ان کے بارہ میں امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ بھی آدمی اور ہم بھی آدمی (ھم رجال ونحن رجال) یہی صحیح اسلامی مسلک ہے اور یہی میرا مسلک ہے۔ میں صحابہ کرام کو تنقید سے مستثنیٰ سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی صحابہ کرام پر تنقید نہیں کی اور نہ بقید ہوش وحواس ایسا کر سکتا ہوں۔ مگر صحابہ کے بعد دوسری اسلامی شخصیتوں پر علمی تنقید کی جا سکتی ہے۔ اور ایسی تنقید ہر دور میں علماء امت کے درمیان جاری رہی ہے۔ غیر صحابہ پر تنقید کے معاملہ میں کبھی کسی نے نکیر نہیں کی۔

تاہم غیر صحابہ پر تنقید کے سلسلہ میں بھی ایک فرق کو ملحوظ رکھنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ تنقید ہو نہ کہ تعیب۔ یعنی علمی اختلاف رائے ہو نہ کہ ذاتی الزام تراشی۔ مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸) کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے نکاح نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کے نکاح نہ کرنے کو میں ایک ذاتی مسئلہ قرار دوں گا اور اس کی بنیاد پر ان کے اوپر کوئی تنقید نہیں کروں گا۔ مگر ان کی کتابیں میرے نزدیک مقدس نہیں۔ ان میں اگر کوئی بات غیر صحیح نظر آئے تو اس پر علمی حدود میں تنقید کی جا سکتی ہے۔

مزید وضاحت کے لئے میں نے اپنی الماری سے ابن تیمیہ کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل

دین المسیح نکالی۔ یہ ضخیم کتاب ابن تیمیہ نے ایک عیسائی عالم کے جواب میں لکھی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحیح کتاب ہے۔ مگر اس کی بہت سی باتیں مناظرانہ انداز کی ہیں۔ خالص شرعی معیار پر وہ درست نہیں۔

مثال کے طور پر کتاب کے جز ۴۱ میں انھوں نے اس بات کی مختلف دلیلیں دی ہیں کہ دین مسیح کے مقابلہ میں دین محمدی زیادہ کامل ہے۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا دین پہنچایا جب کہ دوسرے پیغمبروں نے پورا دین نہیں پہنچایا:

فضمن الله له العصمة اذ ابلغ رسالاته فلهذا ارشد الناس الى جميع الحق والقى الى الناس مالم يكن غيره من الانبياء القاءه خوفا ان يقتلوه كما يذكرون عن المسيح وغيره (صفحہ ۱۴)

اللہ نے تبلیغ رسالت کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ضمانت لے لی تھی۔ اس لئے آپ نے لوگوں کو پورا حق بتایا۔ آپ نے لوگوں کو وہ باتیں پہنچائیں جو آپ کے سوا دوسرے نبیوں کے لئے ممکن نہ ہوسکیں کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ لوگ ان کو قتل کر دیں گے جیسا کہ مسیح اور دوسرے نبیوں کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ بات بذات خود صحیح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دین کامل ہے۔ مگر اس کی مذکورہ توجیہہ ہرگز صحیح نہیں۔ یہ قرآن کی تصریحات سے ٹکراتی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ اللہ نے اپنے تمام پیغمبروں کی پوری مدد فرمائی۔ کسی پیغمبر کو اللہ نے اس طرح بے حفاظت نہیں چھوڑا کہ وہ لوگوں کی تعدی کے خوف سے خدا کی وحی کو کامل طور پر لوگوں تک نہ پہنچائے۔

جہاں تک موجودہ انجیل کا تعلق ہے، اس میں اس سلسلہ میں متضاد باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس میں ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ جو باتیں میں نے اپنے باپ سے سنیں وہ سب تم کو بتا دیں (یوحنا ۱۵ : ۱۵) دوسری طرف انجیل میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ساری باتیں نہیں بتا رہا ہوں۔ تاہم اس کا سبب، انجیل کے بیان کے مطابق قتل کا خوف نہیں بلکہ مخاطبین کا عدم تحمل ہے۔ اس سلسلہ میں انجیل کے الفاظ یہ ہیں ____ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے:

I have yet many things to say unto you, but ye cannot bear them now. (St. John 16:12)

اگر بالفرض حضرت مسیح نے یہ کہا ہو کہ میں تم کو پوری بات نہیں بتا رہا ہوں تو اس کا سبب خود انجیل کے بیان کے مطابق ، یہ نہیں تھا کہ حضرت مسیح اس معاملہ میں اپنی ذات کے بارہ میں خوف رکھتے تھے ۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ آنجناب کے نزدیک آپ کے مخاطبین اس کی استعداد نہیں رکھتے تھے کہ وہ پوری بات کا تحمل کر سکیں۔

یہ ایک عام شرعی اصول ہے جس پر خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے۔ مثلاً مکہ میں آپ پر شراب اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی بابت احکام نہیں اترے ۔ کیوں کہ اس وقت لوگوں کے اندر اس کو قبول کرنے کا مادہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کسی بھی درجہ میں کوئی ممنوع چیز نہیں۔ جو چیز ممنوع ہے وہ اسلوب تنقید ہے نہ کہ خود تنقید ۔ تنقید کا مطلب دلائل کے ذریعہ اختلاف رائے ہے۔ اس معنی میں تنقید بلاشبہہ مطلوب ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کو سب وشتم کرے یا بلا دلیل کسی کی مذمت کرنے لگے تو ایسا فعل یقیناً غیر شرعی ہوگا۔ اندیشہ ہے کہ ایسا آدمی اللہ کے یہاں سخت پکڑ میں آجائے۔

مزید یہ کہ تنقید زندگی کی علامت ہے ۔ زندہ قومیں تنقید کا استقبال کرتی ہیں۔ جو لوگ حق کے طالب ہوں وہ کبھی تنقید کو برا نہیں مانیں گے ۔ البتہ جو لوگ شخصیتوں کے پرستار بن جائیں وہ ضرور تنقید کو سن کر بپھر اٹھیں گے ، کیوں کہ تنقید کی زد ہمیشہ شخصیتوں پر پڑتی ہے نہ کہ حق وصداقت پر۔

خطابات کا خلاصہ

۱. قرآن فہمی کی کلید کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف باتیں بتائی جاتی ہیں۔ مثلاً عربی دانی، شان نزول کی روایات، ربط ونظم، ناسخ اور منسوخ کا علم، انقلابی طرز فکر۔ اس قسم کی چیزیں قرآن فہمی میں مددگار ہوسکتی ہیں۔ مگر وہ قرآن فہمی کی کلید نہیں ہیں۔ قرآن فہمی کی کلید کوئی ایسی ہی چیز ہوسکتی ہے جس کا ذکر خود قرآن میں موجود ہو۔ قرآن کے مطابق، قرآن فہمی کی کلید صرف ایک ہے، اور وہ تقویٰ ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ھدًی للمتقین۔ تقویٰ آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے اور سنجیدگی ہی کسی کلام کو سمجھنے کی واحد کلید ہے۔

۲. تربیت کیا ہے۔ تربیت معروف قسم کے تربیتی کورس کا نام نہیں اور نہ متصوفانہ مشقوں سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ تربیت کا تمام تر تعلق ذہنی بیداری سے ہے جس کو قرآن میں تدبر اور تفکر کہا گیا ہے۔ آدمی کے اندر تدبر اور تفکر جتنا زیادہ بڑھے گا اتنا ہی اس کا ذہنی ارتقار ہوگا اور اسی نسبت سے اس کی روح میں معرفت اور تعلق باللہ کی صفات پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ تربیت کا ذریعہ فکری بیداری ہے نہ کہ عضویاتی مشقیں۔

۳. جنت کس کے لئے ہے اور جہنم کس کے لئے۔ قرآن کے مطابق، جنت پاک روح کے لئے ہے اور جہنم آلودہ روح کے لئے۔ آدمی ہر آن انھیں دونوں چیزوں کے درمیان ہے۔ زندگی کا ہر موقع آدمی کو دو امکان کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ ایک رویہ سے وہ اپنی روح کو پاک کرکے جنتی بن جاتا ہے اور دوسرا رویہ اختیار کرکے وہ اپنی روح کو گندا کرتا ہے اور اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے۔

۴. قولِ لاالٰہَ اِلّا اللّٰہ کیا ہے جو آدمی کو جنت میں لے جاتا ہے۔ قول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اوپری طور پر صرف زبان سے ادا کیا جائے۔ دوسرا وہ جو قلب کی گہرائی سے نکلے۔ اول الذکر کو تلفظ کلمہ اور ثانی الذکر کو معرفت کلمہ کہہ سکتے ہیں۔ تلفظ کلمہ کی دین میں کوئی حقیقت نہیں۔ مگر معرفت کلمہ انتہائی قیمتی ہے۔ وہ آدمی کی پوری زندگی کو بدل کر اُس کو اِس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کا انتخاب جنت میں بسانے کے لئے کیا جائے۔

۵. دعوت الی اللہ کیا ہے۔ دعوت الی اللہ وہ تبلیغی جد وجہد ہے جو غیر مسلموں میں دین کے

تعارف کے لئے کی جاتی ہے۔ ختم نبوت کے بعد یہی امت محمدی کا خارجی مشن ہے۔ اسی فریضہ کی ادائیگی پر امت محمدی کا امت محمدی ہونا متحقق ہوتا ہے۔ امت محمدی اگر اس کام کے لئے نہ اٹھے تو اس کی اصل حیثیت ہی مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔

۶۔ جہاد فی سبیل اللہ کب کیا جاتا ہے۔ اس کی مختلف ابتدائی شرائط میں سے ایک لازمی شرط تیاری (اعداد) ہے۔ تیاری کا معیار، قرآن کے مطابق اعداد تا حد ارہاب ہے۔ یعنی اتنی تیاری کہ فریق مخالف اس سے ہیبت زدہ ہو جائے۔ اس قسم کی تیاری کئے بغیر جہاد کا اقدام کرنا جہاد نہیں فساد ہے۔ کیوں کہ ایسا جہاد اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف تباہی میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

۷۔ دعا کیا ہے۔ دعا یہ نہیں ہے کہ آپ کچھ الفاظ یاد کرلیں اور ان کو اپنی زبان سے دہراتے رہیں۔ دعا عاجز مطلق کا قادر مطلق کو پکارنا ہے۔ دعا اس وقت دعا بنتی ہے جب کہ بندہ اپنے مسئلہ کو خدا کا مسئلہ بنادے۔ جب خود خدا کی خدائی کا یہ تقاضا بن جائے کہ وہ اپنے بندہ کی پکار پر دوڑ پڑے۔

۸۔ اللہ کی راہ میں رونا کیا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لئے رونا وہ معتبر ہے جو تنہائیوں میں پیش آئے۔ جب آدمی اکیلا ہو۔ وہ اپنے رب کی عظمتوں کو یاد کرے اور خوف و محبت کے جذبہ کے تحت اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑیں۔ مجمع میں رونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

۹۔ شکر کیا ہے۔ شکر ملے ہوئے کی قدر دانی کرنے کا نام ہے۔ جب آدمی ملی ہوئی چیز کی قدر پہچانتا ہے اس کے بعد ہی اس کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ ابلتا ہے۔ جس آدمی کی نظریں نہ ملے ہوئے پر لگی ہوئی ہوں وہ ملے ہوئے کی قدر نہیں پہچانے گا۔ اس لئے شکر کا جذبہ بھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوگا۔

۱۰۔ ذکر کیا ہے۔ ذکر کسی قسم کے رٹے ہوئے کلمات کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ ذکر در اصل یاد کا نام ہے۔ جس کی یاد آدمی کے دل میں آئے اسی کی نسبت سے جذبات اس کے اندر پیدا ہوں گے۔ خدا سب سے بڑی ہستی ہے۔ وہی دینے والا ہے اور وہی چھیننے والا۔ اس لئے جب آدمی خدا کو یاد کرتا ہے تو وہ خدا کی عظمت و جلال میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کا سینہ ایک قسم کے

ا بھونچال کا تجربہ کرتا ہے۔ یہی وہ یاد الٰہی ہے جس کو ذکر کہا گیا ہے۔

۱۱ خدا پرستی کا معیار کیا ہے۔ خدا پرست ہونے کا معیار یہ ہے کہ آدمی کا جب یہ حال ہو جائے کہ تنقید اس کو بری نہ لگے اور تعریف پر اس کو خوشی نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا پرست بن گیا۔ خدا پرست ہونا دراصل خدا کو اس کی صفات کمال کے ساتھ پالینے کا نام ہے۔ اور جو بھی خدا کو اس کی صفات کمال کے ساتھ پالے اس کے لئے تنقید بھی بے معنی ہو جاتی ہے اور تعریف بھی بے معنی۔

۱۲ علمی طریق فکر کیا ہے۔ علمی طریق فکر کا خلاصہ اس عربی مثل میں ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں)، جب بھی آپ کو کسی بات کی حقیقت جاننا ہو تو اس کی ضد دریافت کیجئے اور دونوں کا تقابل کیجئے، اس کے بعد اصل حقیقت اپنے آپ واضح ہو جائے گی۔

۱۳ اکابر پرستی کی پہچان کیا ہے۔ اکابر پر تنقید سن کر جب آپ کو غصہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ اکابر پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔

۱۴ قسط پر قائم رہنے والا کون ہے۔ قسط پر قائم رہنے والا وہ ہے جو اپنے آپ کو بھی اسی ترازو پر تولے جس ترازو پر وہ دوسروں کو تول رہا ہے۔ جس آدمی کے پاس اپنے لئے دوسرا باٹ ہو اور غیروں کے لئے دوسرا باٹ، وہ عادل نہیں ہے بلکہ ظالم ہے۔

سوال و جواب

ایک صاحب نے کہا کہ آپ تمام اکابر ملت پر تنقید کرتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک ان اکابر میں کوئی بھی نہیں جو واقعۃً صحیح اور درست ہو۔

میں نے کہا کہ یہ میرے اوپر الزام ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ میں تمام اکابر ملت پر تنقید کرتا ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے کچھ رہنماؤں نے جدید مسائل کے حل کے لئے جو تدبیر اختیار کی، میں اس تدبیر کار پر تنقید کرتا ہوں۔ اور تدبیر کار پر تنقید کرنا سرے سے کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ تدبیر کار کے معاملہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے صحابہ نے اختلاف کیا۔ اس کے بعد امت کی پوری تاریخ میں ہمیشہ اس قسم کے اختلافات کئے جاتے

رہے ہیں۔ پھر اگر میں امت کے اس متواتر عمل کی تقلید کرتا ہوں تو اس میں آخر اعتراض کی
بات ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الا
مانتے۔ اتنی بڑی گستاخی کرنے کی جرأت آپ کو کیسے ہوئی۔

میں نے کہا کہ یہ ایک لغو الزام ہے جو میرے اوپر عائد کیا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں میرا م
عین وہی ہے جو ہمیشہ سے علماء امت کا مسلک رہا ہے۔ اگر آپ اس معاملہ کو سنجیدگی کے سا
چاہتے ہیں تو مشہور بزرگ اور عالم ابن کثیر الدمشقی کی تفسیر (۱/۳۰۴) کو پڑھ لیجئے۔ انھوں ن
امت کی نمائندگی کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے عین وہی میرا مسلک ہے۔ آپ اس کو پڑھیں او
میں جو کچھ لکھا ہے اسی کو میری طرف سے بھی نوٹ کر لیں۔ کیوں کہ اس کے سوا میرا اور کوئی علیح
نہیں۔ اگر آپ فی الواقع اس معاملہ میں سنجیدہ ہوں تو میرے اس جواب کے بعد آپ کی زبا
کے لئے بند ہو جانی چاہئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ شوق سے پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے آپ کے
انداز سے اختلاف ہے۔ آپ کو چاہئے کہ غیر تنقیدی انداز میں لکھیں اور تنقیدی اند
چھوڑ دیں۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ اس معاملہ کو ایک سادہ معاملہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ کو
معاملہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ زندگی میں ہمیشہ دو میں سے ایک کے درمیان انتخاب کرنا پڑ
سادہ لوح قسم کے لوگ تیسرا انتخاب لینا چاہتے ہیں۔ مگر تیسرا انتخاب موجودہ دنیا میں کبھ
ہوتا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے جو انتخاب (چوائس) ہے وہ تنقید اور
میں نہیں ہے۔ بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ اگر آپ تنقید کو ختم کر دیں تو باعتبار نتیجہ
کے حصہ میں آئے گی وہ بے تنقید کی صورت حال نہیں ہو گی بلکہ جمودِ ذہنی کی صورت حال
میں اور آپ میں یہ فرق نہیں کہ میں تنقید کو پسند کرتا ہوں اور آپ بے تنقید کو۔ بلکہ ا
یہ ہے کہ میں نے ذہنی بیداری کا چوائس لیا ہے اور آپ ذہنی موت کا چوائس لینا چاہ

پ خود غور کر لیجئے کہ دونوں میں سے کون زیادہ بہتر ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مسلمانوں کو صبر و اعراض کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تو پسپائی کی بات مسلمان تو ایک مجاہد قوم ہیں۔ مسلمانوں کو شیر کی طرح رہنا چاہئے : مذہب مرداں نہ کہ مذہب فندراں۔

میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ پسپائی کہتے ہیں یہ عین وہی طریقہ ہے جس کو تبلیغی جماعت مال سے اختیار کئے ہوئے ہے۔ الرسالہ مشن کے مقابلہ میں تبلیغی جماعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے ں زیادہ بڑے پیمانے پر انھوں نے اس مسلک کو اختیار کر رکھا ہے۔ مولانا الیاس صاحب ۱۹ - ۱۸۸۵) کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلسل تبلیغ کے لوگ اسی طریقہ پر چل رہے مگر اس پوری مدت میں کسی ایک بھی قابل ذکر آدمی نے یہ نہیں کہا کہ تبلیغ والے مسلمانوں کو پسپائی اتے ہیں۔ اس کے برعکس الرسالہ مشن کے بارہ میں بہت سے لوگ شدت کے ساتھ یہی راض کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تبلیغ کے لوگ مسلم مدعو کے مقابلہ میں "پسپائی" کا طریقہ سکھاتے ہیں ہم غیر مسلم مدعو کے سلسلہ میں "پسپائی" کا طریقہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ چونکہ آپ انوں کو اپنی قوم سمجھتے ہیں اس لئے ان کے مقابلہ میں پسپائی آپ کو بری نہیں لگتی۔ مگر غیر ں کو آپ غیر قوم سمجھے ہوئے ہیں اس لئے ان کے مقابلہ میں پسپائی کا موقع ہو تو اس کو آپ وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ یہ حقیقۃً قوم خویش اور قوم غیر کی نفسیات کا مسئلہ ہے نہ کہ پسپائی بہادری کا مسئلہ۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے اپنی کتاب خاتون اسلام میں اپنی والدہ زیب النساء کو ت اسماء رضی اللہ عنہا کے برابر قرار دیا ہے۔ کیا یہ صحابیہ کی توہین نہیں ہے۔ آپ کی والدہ ایک یہ کے برابر کس طرح ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ ایک سراسر نادانی کا اعتراض ہے۔ آپ خاتون اسلام کو پڑھئے۔ اس کے صفحات میں جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ یہ نہیں ہے کہ میری والدہ اپنے درجہ کے اعتبار سے یہ کے برابر ہیں۔ وہاں موازنہ صحابیہ اور غیر صحابیہ کے درمیان نہیں ہے بلکہ عورت کے بارہ میں

اسلامی تصور اور غیر اسلامی تصور کے درمیان ہے۔ اور میں نے اسلامی نقطۂ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے تین معلوم خواتین کی مثال دی ہے۔

عورت کے بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عورت کا مقام عمل (rkplace) بنیادی طور پر اس کا گھر ہے۔ مگر اہل مغرب کا کہنا ہے کہ عورت گھر کے اندر رہ کر کوئی بڑا کام نہ کر سکتی۔ اس لئے سماجی عمل میں شریک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو باہر لایا جائے۔ میں نے کتاب میں مغربی نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ نظری دلائل کے علاوہ اس سلسلہ میں میں نے خواتین کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ ایک، اسلامی دور کی خاتون حضرت اسماء۔ دوسرے، تار ایک خاتون نور جہاں۔ تیسرے، ذاتی تجربہ کے دائرہ کی ایک خاتون زیب النساء۔ ان تین حقیقی کا حوالہ دے کر میں نے بتایا ہے کہ ایک عورت گھر کے اندر رہ کر بھی بڑے بڑے اجتماعی کام کر سکتی

اس پوری بحث میں جو نکتۂ اثبات ہے وہ یہ نہیں ہے کہ میری ماں صحابیہ کے برابر ہیں۔ بلکہ اثبات یہ ہے کہ مغرب کا نقطۂ نظر بے بنیاد اور اسلام کا نقطۂ نظر عین درست ہے۔ ایسی حالت مذکورہ اعتراض سراسر بے معنی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ جب بھی کسی چیز کی مثال دینا ہو تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بہت پہلو ہوتے ہیں۔ مگر علم الادب کا یہ مستقل اصول ہے کہ کسی کلام میں جب کوئی مثال لائی جائے تو وہاں کا صرف مطلوبہ پہلو منطبق ہوگا۔ بقیہ تمام پہلو اپنے آپ حذف ہو جائیں گے۔

اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں ضعف کو بتانے کے لئے مکھی (الحج ۳، مثال دی گئی ہے۔ مکھی میں ضعف کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیتیں ہیں۔ مثلاً مکھی ہمیشہ گندگی اوپر بیٹھتی ہے۔ مگر قرآن کی مذکورہ آیت میں مکھی کا صرف ضعف کا پہلو منطبق کیا جائے گا، اس کا گند کا پہلو اپنے آپ حذف ہو جائے گا۔ اسی طرح خاتون اسلام میں جن عورتوں کی مثال دی گئی۔ ان کا صرف وہ پہلو وہاں مراد ہوگا جو زیر بحث نکتہ سے متعلق ہے۔ ان کے بقیہ پہلو وہاں حذف قرار پائیں گے۔

ایک کشمیری مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم کہاں تک صبر کریں۔ ہندستان نے ہم کو اپنے دستور کی دفعہ ۳۷۰ دی تھی۔ اس کو بھی اس نے عم

سے چھین لیا۔

میں نے کہا کہ آپ صحابہ والا ذہن پیدا کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہندستان نے آپ سے تین سو ستر کو چھین کر آپ کو تین کروڑ ستر دے دیا ہے۔ ایران کے بادشاہ یزدگرد نے صحابی کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ دیا۔ صحابی اس پر غصہ نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ کہا کہ شاہ ایران نے تو اپنا ملک ہی ہمارے حوالے کر دیا۔ انھوں نے ایک تحقیری معاملہ سے اپنے لئے حوصلہ کی خوراک حاصل کر لی۔

۳۷۰ نے آپ کو محدود رقبہ میں سمیٹ دیا تھا۔ اب موجودہ حالت آپ کو وسیع تر رقبہ میں کھینچ لائی ہے۔ اس نے آپ کو چھوٹی ریاست کے دائرہ سے نکال کر ایک بڑے ملک کے دائرہ میں پہنچا دیا ہے۔ اس نے آپ کے مواقع کار کو داخلی حدوں سے نکال کر خارجی وسعتوں تک پھیلا دیا ہے۔ پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ آپ صحابی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس بظاہر منفی واقعہ سے مثبت سبق لیجئے اور اس کو اپنی وسیع تر کامیابی کے لئے استعمال کیجئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الرسالہ میں ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ صبر کی حد کیا ہے۔

میں نے کہا کہ صبر کی حد یہ ہے کہ صبر کرنا ناممکن ہو جائے۔ صبر کے تمام تقاضوں کے ساتھ اس کا تجربہ کیجئے اور جب تجربہ ناکام ہو جائے تو اس کے بعد حسب حالات صبر کے بجائے دوسرے طریقہ کو آزمایا جائے۔ ہندستان کے مسلمانوں نے ابھی تک صبر کا تجربہ ہی نہیں کیا، اس لئے یہاں ابھی تک صبر کی حد بھی نہیں آئی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے امام حسین پر تنقید کی ہے۔ اس کے لیے آپ کے پاس کیا جواز ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے امام حسین پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ امام حسین کا اقدام ایک اجتہادی خطا تھا، اور یہی تمام علماء امت کا موقف ہے۔ آپ "راہ عمل" میں اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اگر وہ کمیونی کیشن کا زمانہ ہوتا تو کربلا کے معاملہ کی نوبت ہی نہیں آتی۔ امام حسین اس خبر کی بنیاد پر مکہ سے روانہ ہوئے تھے کہ کوفہ کے لوگوں نے آپ کی خلافت کی بیعت کر لی ہے۔ مگر جب کوفہ کے پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر صحیح نہ تھی اور بیعت کرنے والے تمام لوگ اپنی بیعت سے پھر چکے ہیں تو آپ نے دوبارہ مکہ واپسی کا فیصلہ کیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ زمانہ اگر

"ٹیلیفون" کا زمانہ ہوتا تو یہ اطلاع آپ کو مکہ ہی میں مل جاتی اور آپ اپنا سفر ملتوی کر دیتے۔ کوفہ کا اموی گورنر جس نے امام حسین کو مکہ واپسی کی اجازت نہیں دی، اگر یہ ٹیلیفون کا دور ہوتا اور وہ دمشق سے فوری رابطہ قائم کر کے یزید کی ہدایت معلوم کرتا تو یقینی طور پر یزید اس سے کہتا کہ ان کو مکہ واپس جانے دو، ان سے تعرض نہ کرو۔

۱۶ جنوری کو محبوب نگر کے کریسنٹ پبلک اسکول میں اجتماع ہوا۔ اس میں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ میں نے کچھ آیتوں کی روشنی میں دعوت کی اہمیت واضح کی۔ پھر بتایا کہ موجودہ حالات میں ہم دعوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ علم کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک الہامی علم (revealed knowledge) اور دوسرے ثابت شدہ علم (established knowledge) الہامی علم کی بنیاد پیغمبرانہ وحی ہے۔ اور ثابت شدہ علم کی بنیاد انسانی ریسرچ ہے۔ آدمی کو انھیں دو میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بولنا چاہئے۔ حبیب بھائی نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دو کے علاوہ کسی اور بنیاد پر جو مسئلہ اٹھایا جائے وہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ فتنہ ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں آپ نے بالکل درست فرمایا۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ آجکل کے لوگ اکابر کے اوپر تنقید کو سن کر فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خدا پر تنقید کی جائے تو وہ غصہ نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ خدا کے دین پر نہیں ہیں بلکہ اکابر کے دین پر ہیں۔ اکابر کا تقدس مشتبہ ہو تو وہ ڈرتے ہیں کہ وہ اپنی دینی زمین سے محروم ہو رہے ہیں۔ چونکہ وہ خدا کے دین پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لئے خدا پر تنقید کے بعد بھی انھیں یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ وہ بے زمین نہیں ہوئے ہیں۔

جناب عزیز احمد خاں صاحب حیدر آباد کی معروف شخصیت ہیں۔ وہ ڈاکٹر بھی ہیں اور ایڈوکیٹ بھی۔ انھوں نے عورتوں کی ان بیماریوں پر ریسرچ کی ہے جن کو عام طور پر جادو اور آسیب کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان بیماریوں میں بظاہر کچھ پر اسراریت اور عجوبہ پن ہوتا ہے، اس لئے لوگ ان کو جادو اور آسیب کا نام دیدیتے ہیں۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں۔ اس قسم کی بیماریاں وہمی باتوں یا رحمی خرابیوں

کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں اور وہ پوری طرح قابل علاج ہیں۔ میں نے خود کئی پیچیدہ کیس میں ہومیوپیتھک طریق علاج کو آزمایا ہے اور الحمد للہ کامیابی حاصل کی ہے۔ لوگوں کو ان بیماریوں کا دماغی اور نفسیاتی علاج کرانا چاہئے۔ مذکورہ موضوع پر جناب عزیز احمد خاں صاحب کا ایک مضمون ماہنامہ بیسویں صدی، اگست ۱۹۹۲ میں چھپا ہے۔

راقم الحروف کا خیال بھی ذاتی طور پر یہی ہے۔ اس قسم کی تمام باتیں خود اپنے دماغی اختلال کا نتیجہ ہوتی ہیں نہ کہ کسی خارجی عمل کا نتیجہ۔ جن یا شیطان کا وجود بلاشبہ برحق ہے۔ مگر شیطان کو انسان کے اوپر کوئی قدرت حاصل نہیں۔ شیطان صرف بہکانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی معاملہ بہکانے سے زیادہ ہو تو اس کو شیطان یا جن کے بجائے کسی اور چیز کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

• حیدرآباد کے ایک بزرگ نے اپنی تازہ کتاب دی۔ اس کا نام "افکار جدید اور مذہب" ہے۔ اس کے مقدمہ میں بتایا گیا ہے کہ سرسید سے متاثر ان کے ایک ساتھی مولوی چراغ علی (۱۸۹۵-۱۸۴۴) نے ایک کتاب لکھنا شروع کیا تھا جس کا نام العلوم الجدیدۃ والاسلام تھا۔ یہ کتاب تہذیب الاخلاق میں چھپنا شروع ہوئی۔ ابھی صرف تمہیدی حصہ لکھا تھا کہ مولوی چراغ علی کی وفات ہو گئی۔ سرسید نے ان کی وفات پر تہذیب الاخلاق میں لکھا:

"افسوس کہ وہ مضمون لاحل سوال کا جواب جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا۔ اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

سرسید کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ مولوی چراغ علی نے اس معاملہ کی پہلی اینٹ رکھ دی ہے۔ اب دوسرے اہل ملت آگے بڑھیں اور اس کام کی تکمیل کریں۔ مذکورہ الفاظ اچھا مرثیہ ہو سکتے ہیں مگر وہ اچھی رہنمائی نہیں۔

مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد کی ایک معروف دینی شخصیت ہیں۔ ملاقات کے دوران ان سے مفید گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اپنے سہ ماہی جریدہ صفا کا ایک خصوصی شمارہ "فقہ اسلامی؛ اصول، خدمات اور تقاضے" کا ایک نسخہ دیا۔ ۴۵۶ صفحات کی یہ فقہی دستاویز دارالعلوم سبیل السلام کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

اس کے مختلف حصے دیکھے۔ ایک مقالہ "مصالح مرسلہ" کے موضوع پر تھا۔ مقالہ نگار نے

اس میں لکھا تھا : مصالح مرسلہ کے بارہ میں اہل سنت کے چاروں دبستان فقہ کا نقطۂ نظر کیا ہے اس کی ابتدا از مالی، ترتیب کے اعتبار سے فقہ حنفی سے ہونی چاہئے تھی۔ لیکن یہ گنہگار اس کا آغاز فقہ مالکی سے کر رہا ہے۔ کیوں کہ مالکیہ ہی نے استصلاح یا مصالح مرسلہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ انھوں نے ہی اس کے اصول و قواعد منضبط کئے ہیں۔ اس موضوع پر غور و بحث کا دروازہ کھولا ہے۔ اور غالباً دوسرے مکاتب فقہ کی نسبت اس سے زیادہ کام بھی لیا . . . اس لئے اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ مصالح مرسلہ جیسی اصل کے انضباط کے لئے مالکیہ تمام فقہاء کی تحسین و امتنان کے حقدار ہیں جس کے ذریعہ نئے مسائل کے حل میں مدد لی جاتی رہی ہے۔" صفحہ ۴۷-۲۴۵

مضمون نگار کا یہ اعتراف قابل قدر ہے۔ تاہم اس کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ خیال آیا کہ اس کی کیا وجہ ہے لوگ ماضی کے ایک عالم کی امتیازی خدمت کا اعتراف تو بہ آسانی کر لیتے ہیں۔ مگر وہ ہم عصر عالم کی امتیازی خدمت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اول الذکر اعتراف میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی اور ثانی الذکر اعتراف میں معمولی چیز بھی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا عالم ایک مسلّمہ شخصیت کی حیثیت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ جب کہ معاصر عالم کے حق میں ابھی اس قسم کا تاریخی وزن موجود نہیں ہوتا۔ ماضی کے عالم کو ماننے کے لئے تاریخ کا دباؤ ہی کافی ہے، جب کہ معاصر عالم کو ماننے کے لئے ذاتی معرفت کا سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اور ذاتی معرفت بلاشبہ اس دنیا کی سب سے زیادہ کم یاب متاع ہے۔

حبیب بھائی نے بتایا کہ ایک بار وہ حیدرآباد کے زو میں گئے۔ وہاں انھوں نے ایک شیر کو دیکھا کہ وہ اپنے پنجرہ کے اندر اگی ہوئی گھاس کھا رہا تھا۔ انھوں نے زو کے آدمی سے پوچھا کہ شیر تو ایک گوشت خور جانور ہے۔ وہ گھاس کیوں کھا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے پیٹ کا علاج کر رہا ہے۔ کبھی کبھی شیر کا ہاضمہ بگڑ جاتا ہے یا اس کو قبض ہو جاتا ہے، اس وقت وہ گھاس لے کر اس کا علاج کرتا ہے۔ مصطفیٰ صدیقی صاحب نے بتایا کہ میں نے بھی بلی کو کبھی کبھی گھاس کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرشید صاحب نے کہا کہ طبی اصول سے یہ بالکل قابل فہم ہے۔ کیوں کہ نباتات میں دوا کا فائدہ (medicinal value) موجود ہے۔ اکثر دوائیں نباتات ہی کے ذریعہ بنائی جاتی ہیں۔ قدرت نے ان جانوروں کو گوشت خور بنایا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی فطرت میں یہ شعور رکھ دیا ہے

کہ وہ ہاضمہ کی خرابی کے وقت نباتات لے کر اپنا علاج کرلیں۔

شیر اور بلی وغیرہ میں یہ عادت براہ راست خدائی تعلیم کی بنا پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "گوشت خوری" اگر فطری ہے تو "سبزی خوری" بھی عین فطری ہے۔ ہائی پروفائل کا انداز اگر مطلوب ہے تو لو پروفائل کا انداز بھی عین اسی طرح مطلوب ہے۔ مزید یہ کہ جس وقت لو پروفائل مطلوب ہو اس وقت ہائی پروفائل اختیار کرنا فطرت کی منشا کے خلاف ہے اور یقینی طور پر الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔

حیدر آباد سے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۴۰ کے ذریعہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ کی شام کو روانگی ہوئی۔ جہاز میں انڈین ایرلائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (جنوری ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان میں مچھلی کے شکار (Indian fishing) اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا دنیا کا ساتواں سب سے بڑا مچھلی کے شکار کا ملک (fishing nation) سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت انڈیا میں ۷۹ اکی تعداد میں گہرے سمندر میں مچھلی کا شکار کرنے والے جہاز ہیں۔ ۲۳ ہزار میکنائزڈ بوٹ ہیں۔ اور ایک لاکھ ۲۵ ہزار دیسی ساخت کی کشتیاں ہیں۔ یہ سب مل کر بھی سمندر سے ایک ملین سے کم (0.21 million) ٹن مچھلی نکالتے ہیں۔ ابھی اس میدان میں بہت زیادہ حاصل کرنا باقی ہے۔ ہندستانی سمندروں کے نیچے سمندری خوراک (sea-food) کی قیمتی دولت بہت بڑی مقدار میں موجود ہے۔ اس کو استعمال کرکے انڈیا کو مچھلی کا بہت بڑا ابرآمدی ملک بنایا جاسکتا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم ملک کے وسیع غیر استعمال شدہ ذخائر کو استعمال کریں:

We must tap the country's vast unexploited resources (p.92).

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ صرف ہندستانی سمندر کی بات نہیں، ہم میں سے ہر ایک کی بات ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے وسیع امکانات کے اعتبار سے غیر استعمال شدہ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ابھی اپنے امکانات کو مزید استعمال کرنا ہے۔

جہاز کے اندر مطالعہ کے لیے کئی اخبارات تھے۔ نیوز ٹائم (۲۰ جنوری ۱۹۹۲) میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی مسٹر اظہر الدین کا ایک مضمون تھا۔ انھوں نے ملبورن (آسٹریلیا) کے حالیہ کرکٹ میچ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں ہندستانی ٹیم نے بہت بری کارکردگی (worst performance) دکھائی۔ مگر سچا کھلاڑی وہ ہے جو حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھے۔ چنانچہ انھوں نے کمزوری کا اعتراف

کرتے ہوئے آئندہ کے لئے امید کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا یقین ہے کہ ہر برے لمحہ کے ساتھ اچھا لمحہ بھی ضرور آتا ہے:

I believe that for every bad moment, there is a good one on the way.

یہی زندگی کا صحیح ترین اصول ہے۔ جو لوگ اس اصول کو اپنائیں وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے، وہ ہر شام کے بعد اپنے لئے ایک نئی صبح کو پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

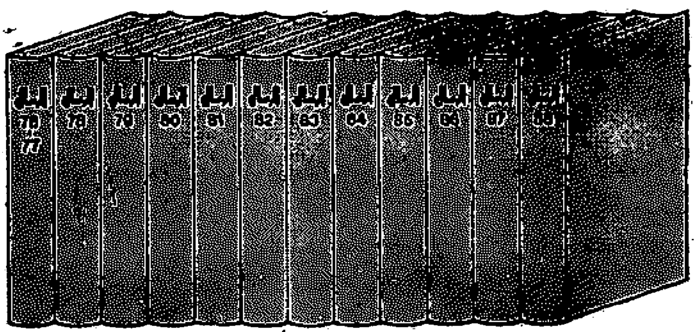
انڈین ایرلائنز کا فلائٹ میگزین سوآگت (جنوری ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون سنگاپور کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سنگاپور کا رقبہ صرف ۲۳۸ مربع میل ہے۔ اور اس کی آبادی تقریباً تین ملین ہے۔ مگر ترقی کے اعتبار سے وہ بہت سے بڑے بڑے ملکوں سے بھی آگے ہے۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۹۰ کے درمیان ۲۰ سال کے عرصہ میں سنگاپور نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔

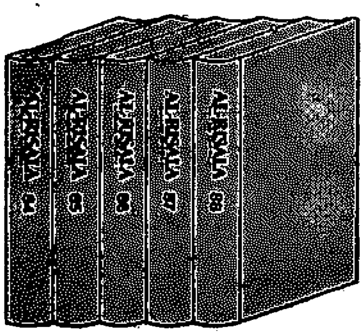
مجھے وہ رپورٹ یاد آئی جو میں نے پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۲۵ دسمبر ۱۹۹۱) میں پڑھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے وزیراعظم مسٹر نواز شریف نے ایک سفر کے دوران سنگاپور کا "معلوماتی دورہ" کیا۔ دوران پرواز انھوں نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بطور خاص سنگاپور آنے کا فیصلہ اس لئے کیا کہ تیسری دنیا کے اس ملک کی ترقی کی حکمت عملی کو جان سکیں۔ انھوں نے کہا کہ سنگاپور کی فی کس سالانہ آمدنی ۱۲ ہزار ڈالر ہے۔ جب کہ پاکستان میں فی کس سالانہ آمدنی ۳۵۰ ڈالر ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے سنگاپور کے حوالے سے پاکستان کی پس ماندگی پر رونا آتا ہے۔ سنگاپور میں نہ قدرتی وسائل ہیں اور نہ زرعی پیداوار۔ لیکن اس ملک نے محض ٹرانزٹ پورٹ کی حیثیت سے اتنی ترقی کی کہ اب وہ دنیا کا ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔ اور ہم دن بدن پیچھے جارہے ہیں جب کہ پاکستان بہترین قدرتی وسائل اور ہنرمند افراد کی قوت سے مالامال ہے۔

سنگاپور کو ایک چھوٹی سی دنیا ملی۔ اس پر قانع ہو کر اس نے ممکن دائرہ میں اپنی ترقی کی جدوجہد شروع کر دی۔ یہی اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد راز ہے۔ جو لوگ ملے ہوئے پر اپنی کوششوں کو مرتکز کرتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ نہ ملے ہوئے کو حاصل کرنے کی طرف دوڑتے ہیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۲ کی شام کو میں دہلی واپس آگیا۔ واپسی کے بعد حیدرآباد اور محبوب نگر سے
[متع]دد خطوط موصول ہوئے۔ محبوب نگر سے جناب محمد عبد القادر صاحب کا ایک خط ملا۔ وہ سادہ اور مختصر
[ط]ور پر حسب ذیل تھا:

"محبوب نگر کا پروگرام بہت سارے احباب کی جانب سے بے حد پسند کیا گیا۔ اور خواہش
[ظاہر کر]ی جا رہی ہے کہ اس طرح کے پروگرام سال میں کم از کم ایک دفعہ ضرور ہونے چاہئے۔ الرسالہ کی ایجنسی
[ک]ی مہم جاری ہے۔ کسی عالم دین کو میں نے یہ پہلا خط لکھا ہے۔ اگر کچھ غلطی ہوئی ہو تو درگذر فرمائیں۔"





الرسالہ (مجلد)

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔

۱ آئی ڈٹنس (Eyewitness) ہندستان ٹائمس کے تحت ویڈیو کیسٹ میگزین بناتے ہیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۹۳ کو اس کی ٹیم اسلامی مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ویڈیو ٹیپ پر لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد اور اجودھیا کے مسائل سے تھا۔

۲ بمبئی کے مسٹر مدھو مہتا (ہندستانی اندولن) کی دعوت پر ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کو بمبئی کا سفر ہوا۔ ۵ فروری کو واپسی ہوئی۔ وہاں مختلف اجتماعات ہوئے جن میں بمبئی کے ممتاز ہندو اشخاص جمع ہوئے۔ یہ لوگ مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ۴ فروری کو خلافت ہاؤس میں عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

۳ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۴ فروری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں تھی۔ اس میں روزہ کے اخلاقی فوائد بتائے گئے۔

۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۱ فروری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ اخلاقیات کے موضوع پر تھی۔ اس میں اچھے اخلاق اور برے اخلاق کو سادہ طور پر بیان کیا گیا۔

۵ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے بھوپال سے اطلاع دی ہے کہ جناب سلمان صاحب نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک میٹنگ سیفیہ کالج میں کی۔ اس میں مشورہ سے طے کیا گیا کہ کالجوں کے نوجوانوں پر مشتمل پیس میکرس نام کی ایک تنظیم بنائی جائے۔ یہ ایک مفید اقدام ہے۔ اسی قسم کا تجربہ ہر جگہ کیا جانا چاہئے۔

۶ ۶ فروری ۱۹۹۳ کو آغا خاں ہال (نئی دہلی) میں نیشنل سدبھاونا کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع سوشل ہارمنی تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی نقطہ نظر پیش کیا۔

۷ نیوز ٹریک (نئی دہلی) کی ٹیم ۱۲ فروری ۱۹۹۳ کی شام کو اسلامی مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نیوز ٹریک کے مارچ ۱۹۹۳ء کے ویڈیو میں شامل کیا جائے گا۔ سوالات کا تعلق ملکی اور اجودھیا کے مسائل سے تھا۔

مسٹر مدھو مہتا اور شریف بمبئی کی دعوت پر ۱۵ فروری ۱۹۹۲ کو بمبئی کا سفر ہوا۔ ۲۰ فروری کو واپسی ہوئی۔ اس دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی اجتماعات میں خطاب کا موقع ملا۔

بمبئی سے مدراس کا سفر ہوا۔ وہاں کانچی کے شنکر اچاریہ سے ملاقات کی۔ اس میں اجودھیا کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس کی خواہش خود شنکر اچاریہ نے کی تھی۔

ڈاکٹر این ایم شیخ (کلیان) لکھتے ہیں کہ اس پرفتن دور میں الرسالہ کا وجود ہندستانی مسلمانوں کے لئے نعمت اور امید کی کرن ہے۔ فی الحال میرے نام الرسالہ کی ۱۰ کاپیاں بطور ایجنسی ہر ماہ روانہ کریں"۔ یہی درست طریقہ ہے۔ جو لوگ بھی الرسالہ کے پیغام سے اتفاق کرتے ہیں ان سب کو یہ کرنا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لیں اور اپنے حلقہ میں اس کو پھیلا کر شعوری بیداری کا کام کریں۔

١ یو این آئی (اردو نیوز سروس) نے روزانہ تمام اخباروں کو الرسالہ کے اقوال بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ مثلاً "آج کا قول" کے عنوان کے تحت انھوں نے ایک قول یہ روانہ کیا: جو مسئلہ اپنی غلطی مان کر ختم ہو سکتا ہے، اس کے لئے دوسروں کی غلطی منوانے کی کوشش کرنا وقت کا ایسا ضیاع ہے جس کا ارتکاب کوئی نادان ہی کر سکتا ہے۔

١ برندا بن (متھرا) کے گیتا آشرم کی طرف سے ۱۳ - ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کو ایک سمواد پریاس منعقد کیا گیا۔ اس میں ملک کے مختلف حصوں سے تقریباً ۵۰ ہندو دانشور شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شرکت کی اور وہاں اسلام کی روشنی میں نئے ہندستان کی تعمیر پر چند تقریریں کیں۔

١١ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے نمائندے نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر موجودہ حالات سے تھا۔ یہ انٹرویو پانچ جنیہ کے شمارہ جنوری ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔

١٢ ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندہ مسز سونارا ولہ نے ۲۸ جنوری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع یونیفارم سول کوڈ تھا۔ بتایا گیا کہ یونیفارم سول کوڈ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔

۱۴ مدھیہ پردیش میں مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے جبلپور کا سفر کیا۔ وہاں آل انڈیا کانفرنس آن نیشنل انٹگریشن میں تقریر کی۔ اور مختلف ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں۔ واپسی میں بھوپال میں قیام رہا اور وہاں بھی تقریر اور ملاقاتوں کے پروگرام میں شرکت ہوئی۔ جبلپور اور بھوپال کے یہ پروگرام جنوری ۱۹۹۳ کے آخری ہفتہ میں ہوئے۔

۱۵ ۲۷ جنوری ۱۹۹۳ کو فکی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اسلام کیا ہے اور اسلام کیا نہیں ہے، کے موضوع پر خطاب کیا۔

۱۶ پروفیسر عبدالکریم صاحب (سائنس اینڈ کامرس کالج، ہبلی) نے اپنے خط مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ کے ذریعہ مطلع کیا ہے کہ ان کے یہاں غیر مسلم اہل علم پرافٹ آف ریولیوشن (پیغمبر انقلاب) کو بہت پسند کر رہے ہیں۔ ایک ہندو جرنلسٹ نے طے کیا ہے کہ وہ اس کتاب کا ترجمہ کناڑا زبان میں کریں۔ وہ لکھتے ہیں:

Your book Muhammad: The Prophet of Revolution has evoked a great deal of interest among non-Muslim scholars. A working journalist, Shri Ghalagi, working for the Kannada paper 'Vishwavani & Prapancha' has expressed his desire to translate the work in Kannada.

۱۷ صدر اسلامی مرکز نے کچھ لوگوں کے ساتھ شرنگیری کا سفر کیا۔ وہاں ۱۶ فروری ۱۹۹۳ کو شنکراچاریہ سے ملاقات کی۔ شانتی مشن میں انھوں نے اپنا پورا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ اس سفر کی تفصیلی رپورٹ انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کی جائے گی۔

۱۸ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں: میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ الرسالہ بھی پڑھتا ہوں۔ ان کو پڑھنے کے بعد میں نے صحیح طور پر اسلام کو سمجھا۔ اور فکری طور پر اس کی طرف مائل ہوا۔ اس سے پہلے میں نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مگر اللہ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ ہدایت دینا منظور تھا۔ اب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا ہوں (سید محمد برکت الرحمن، کھرگ پور، بنگال)

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

و	
القرآن جلد اول	200/-
القرآن جلد دوم	200/-
اکبر	45/-
انقلاب	40/-
ب اور جدید چیلنج	45/-
مت قرآن	30/-
مت اسلام	6/-
مت صحابہ	6/-
کامل	50/-
سلام	40/-
ر اسلام	40/-
امی زندگی	25/-
یار اسلام	20/-
زحیات	60/-
اط مستقیم	40/-
ون اسلام	45/-
کرزم اور اسلام	40/-
ام اور عصر حاضر	30/-
بانیہ	40/-
وان ملت	45/-
یقت حج	30/-
امی تعلیمات	25/-
ام دور جدید کا خالق	25/-
یث رسولؐ	35/-
ری جلد اول	95/-
ری جلد دوم	
نامہ (ملکی اسفار)	
نامہ (غیر ملکی اسفار)	95/-
ات کا سفر	35/-
ت نامہ	20/-
عمل	25/-
ری غلطی	50/-
کی سیاسی تعبیر	20/-
ل حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیات اسلام	-
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقت اسلام	-
علماء اور دور جدید	-
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرت رسولؐ	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-

ہندی

سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-

عربی :

الاسلام یتحدیٰ	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	55/-

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقت ایمان	25/-
A-2	حقیقت نماز	25/-
A-3	حقیقت روزہ	25/-
A-4	حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقت حج	25/-
A-6	سنت رسولؐ	25/-
A-7	میدان عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحاد ملت	25/-
A-12	تعمیر ملت	25/-
A-13	نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ و تفسیر)

A-14	متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15	متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16	متفرق سورتیں ۳	30/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب	200/-
V-2	اسلام دائمی امن	200/-
V-3	اسلام دور جدید کا خالق	200/-
V-4	امت مسلمہ اور جدید چیلنج	200/-
V-5	اسلام اور سماجی انصاف	200
V-6	اسلام اور دور حاضر	200/-

God Arises	75/-
Muhammad The Prophet of Revolution	75/-
Islam As It Is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	-
Introducing Islam	-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	-
Islam the Creator of Modern Age	-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	-
Words of Wisdom	-

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984 تا 1991 — 80/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91 — 85/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

